ڈاکٹر اختر حمید خان کانفرنس

برائے سماجی ترقی

نومبر 2021

ڈاکٹراخترحمید خان کانفرنس
برائے سماجی ترقی

مرتب

سیمالیاقت

نومبر2021

اربن ریسورس سینٹر

ویسٹ لینڈٹریڈسینٹر A-2 دوسری منزل،

شاہراہِ فیصل،نزدبلوچ کالونی پُل۔کراچی

فون نمبر: 92 34387692(21 92)

شعبہ مطالعہءترقیات

سٹی کیمپس،این ای ڈی یونیورسٹی

مولانادین محمدوفائی روڈ۔کراچی

فون نمبر: 9913058,32620793(21 92)

ڈاکٹر اختر حمید خان کانفرنس برائے سماجی ترقی

نومبر 2021

آرگنائزنگ کمیٹی

عارف حسن، ڈاکٹر نعمان احمد، محمد یونس،
منصور رضا، ڈاکٹر سعید الدین، زاہد فاروق،

معاونت:

انعم مفتی، آغا حمیر، مدیحہ سلام، محمد آفتاب، امل ہاشم،
رضوان الحق، محمد جمیل، شکیل گل، سیما لیاقت

ڈاکٹر اختر حمید خان کانفرنس برائے سماجی ترقی

مترجم:

محمد منہاج

سیما لیاقت

ٹرانسکرپشن:

امل ہاشم

محمد آفتاب

راؤ محمد حماد

سیما لیاقت

پہلا سیشن

کومیلا سے اورنگی

پہلا سیشن
کومیلا سے اورنگی 4

دوسرا سیشن
ترقیاتی منصوبوں میں ڈاکٹر اختر حمید کی شمولیت 56

ورک شاپ کی تصویری جھلکیاں 100

فہرست

پہلا سیشن

کومیلا سے اورنگی

صفحہ نمبر		مقررین
7	نظامت	انعم مفتی
7	تلاوت	عاتکہ
7	تعارفی کلمات	ڈاکٹر نعمان احمد
10	مقررِ خاص	ڈاکٹر شعیب سلطان
36	سہولت کار	منصور رضا
37	مقرر	تاج حیدر
41	مقرر	کرامت علی
44	مقررہ	رابعہ صدیقی
45	مقرر	انور راشد
47	مقرر	ڈاکٹر منصور علی
49	مقرر	فیاض باقر
60	مہمان شرکاء	سوال جواب

پہلا سیشن

کومیلا سے اورنگی

انعم مفتی: تمام حاضرین محفل کو آج کے اس پروگرام میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ پروگرام شروع کرنے سے قبل ہم اپنی طالبہ عاتکہ سے درخواست کریں گے کہ وہ تلاوت کے لیے تشریف لائیں۔

عاتکہ: تلاوت و ترجمہ سورۃ توبہ

انعم مفتی: جزاک اللہ عاتکہ! اب ہم پروگرام کا آغاز کرتے ہیں۔ڈاکٹر نعمان احمد سے گزارش ہے کہ وہ آج کی کانفرنس کے حوالہ سے تعارفی گفتگو کریں اور حاضرین محفل پر اس کی مقصدیت و اہمیت کو اجاگر کریں۔لیکن اس سے قبل ضروری ہے کہ ڈاکٹر نعمان کا مختصر تعارف پیش کیا جائے۔ ڈاکٹر پروفیسر نعمان احمد ایک معروف آرکیٹیکٹ ہیں۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب این ای ڈی یونیورسٹی کے شعبہ آرکیٹکٹ میں اپنی تدریسی ذمہ داریاں ادا کررہے ہیں۔ساتھ ہی وہ شعبہ کے ڈین بھی ہیں۔اس کے علاوہ پاکستان کی کئی این جی اوز ہی بی اوز سے ڈاکٹر صاحب کی وابستگی ہے۔کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔تحقیقی پروجیکٹ پر کام کرتے رہے ہیں۔اخبارات میں ان کے آرٹیکل ہم باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب کے کام کو ہمیشہ سراہا جاتا رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہیں حال ہی میں حکومتِ پاکستان نے تمغہ امتیاز بھی دیا ہے۔جو یقیناً ہم سب کے لیے ایک اعزاز کی بات ہے۔

ڈاکٹر نعمان احمد: بہت شکریہ انعم! ہمارے لیے خوشی کی بات ہے کہ آج یہاں ہمارے محترم

اساتذہ موجود ہیں۔ ہمارے خاص مقررین جناب شعیب سلطان، عارف حسن صاحب یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ان کی موجودگی ہمارے لیے اطمینان کا باعث ہے۔تسنیم احمد صدیقی، تاج حیدر، کرامت علی، فضل نور، رابعہ صدیقی، مصطفیٰ بلوچ محمد یونس آج کے مقررین ہیں جبکہ وہ ساتھی جو یہاں موجود نہیں لیکن انہوں نے ہمیں اپنے آڈیو وڈیو میسج بھیجے جس میں سمیرا گل، حافظ راشد، انور راشد، منصور علی ہیں۔اس کے علاوہ عزیز طلباء جو آج اس پروگرام میں تشریف لائے ہیں ان نوجوان طلباء کی یہاں موجودگی خوش آئند ہے۔

میں آپ تمام لوگوں کو شعبہ آرکیٹکٹ اینڈ پلاننگ کی جانب سے انہیں خوش آمدید کہتا ہوں اور آپ سب کی آمد پر شکر گزار ہوں۔

پروگرام کے دو حصے ہیں جنہیں ہم نے موضوعاتی اعتبار سے بھی نام دیا ہے پہلا حصہ کومیلا سے اورنگی ہے۔جس کے ماڈریٹ ہمارے ساتھی منصور رضا ہیں دوسرے حصہ کو ”شہری ترقیاتی منصوبوں میں ڈاکٹر اختر حمید خان کی شمولیت“ کا نام دیا گیا ہے جسے ہمارے دوست فضل نور ماڈریٹ کریں گے۔جبکہ انعم مفتی صاحبہ ایک سہولت کار کے طور پر پروگرام کے آخر تک ہمارے ساتھ رہیں گی۔اس کے علاوہ بھی ہمارے بہت سارے دوست اور طلباء آج اس پروگرام کو ترتیب دینے میں مصروف ہیں جو ایک لمبی فہرست ہے۔ان سب کے ہم شکر گزار ہیں۔

جیسا کہ آپ لوگوں کے علم میں ہے کہ آج کی یہ کانفرنس ڈاکٹر اختر حمید خان کے کام،ان کے افکار اور ان کا فلسفہ یہ سب ہمیں ان کے اثاثہ کے طور پر نظر آتا ہے۔اس پر بات کرتے ہوئے اس میں مزید سیکھنے کے پہلو تلاش کرنے ہیں۔ڈاکٹر صاحب ایک عہد ساز شخصیت تھے۔ان کے قائم کیے ہوئے ادارے، ان کی طرف سے ایک نئی سوچ کی آمد یہ آج تک مفید ہیں۔انہوں نے ایک نئی سوچ کا زاویہ عطا کیا تھا۔جو ہمیں آگے بڑھنے کی ترغیب دیتا ہے۔یہی مقصد ہے جس کے لیے ہم نے اس کانفرنس کا انعقاد کیا ہے۔یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ یہ سب لوگ مختلف اداروں میں

اپنی اپنی جگہ گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔پھر بھی اس بات کی ضرورت تھی کہ اس پوری کاوش کو ایک نئے زاویہ کے ساتھ دیکھا جائے۔خاص کر ہمارے جو طالب علم ہیں وہ ڈاکٹر صاحب کے کام اور ان کے فلسفہ سے زیادہ واقف نہیں ہیں۔اس کانفرنس کے ذریعہ ایک کوشش یہ بھی ہے کہ ان طلباء کو ڈاکٹر صاحب کے کام کے بارے میں بتایا جائے کہ ان کے قائم کیے ہوئے ادارے کس نہج پر کام کر رہے ہیں اور انہیں پھر سے کس طرح re-visit کرنے کی ضرورت ہے۔
اس کانفرنس کا مقصد جہاں ڈاکٹر صاحب کی سوچ اور ان کے اثاثوں کا پھر سے جائزہ لینا ہے وہاں ان نوجوانوں کو جو ترقی کے اس عمل کو سمجھنا چاہتی ہے، دیکھنا چاہتی ہے۔انہیں بھی باخبر کرنا اور ایک عملی جدوجہد میں شامل کرنا بھی ہے۔یہ اس کانفرنس کا اہم مقصد ہے۔

ظہرانہ کے بعد میں اور میرے ساتھی صبح کی اس مجلس میں جو بھی باتیں کی جائیں گی۔ان پر گفتار تازہ کریں گے۔ان طلباء کی جو سوچ بنے گی اس کی تفصیلات ای میل کے ذریعہ میں اپنے تمام ساتھیوں کو فراہم کر چکا ہوں۔اس امید کے ساتھ آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آج کی یہ کانفرنس ہم سب کے لیے ایک اہم اکتسابی عمل ہو گا کہ ہم ڈاکٹر صاحب کے سوچ اور فلسفہ کو سمجھیں۔

انعم مفتی: شکریہ نعمان صاحب! پروگرام کو آگے لیکر چلتے ہیں۔ہمارا پہلا سیشن" کومیلا سے اورنگی" ہے۔جس کے اہم مقرر ڈاکٹر شعیب سلطان ہیں۔شعیب سلطان صاحب Rural Support Programme کے بانی و سینیئر ہنما ہیں۔انہوں نے 1982 میں آغا خان رورل سپورٹ پروگرام کی بنیاد رکھی۔ڈاکٹر شعیب سلطان نے پاکستان، انڈیا اور ساؤتھ ایشیا میں مختلف پروگرام شروع کیے۔ڈاکٹر صاحب National Rural Support Programme (NRSP) کے چیئرمین بھی ہیں۔ان کی خدمات کے صلہ میں انہیں 500 اعزازات مل چکے ہیں جو ان کے کام کا بہترین خراجِ تحسین ہے۔1989 میں United Nations Environment Programme Global 500 Award، 1990 میں

ستارہء امتیاز، 1992 میں Ramon Magsaysay اور WWF Duke of Edinburgh Conservation Award اس کے علاوہ روٹری انٹرنیشنل پاکستان کی جانب سے 2005 میں گولڈ میڈل، 2007 میں حکومتِ پاکستان کی جانب سے ستارہ ء ایثار اور ہلالِ امتیاز سے نوازا گیا۔ 2009 میں سینیئر اشوکا فیلو کے طور پر منتخب ہوئے۔ 2009 میں ہی نوبل امن انعام کے لیے بھی منتخب ہوئے۔ 2019 میں حکومتِ پاکستان کی جانب سے نشانِ امتیاز بھی حاصل کر چکے ہیں کئی کتابوں اور تحقیقی کاموں کے مصنف ہیں۔ڈاکٹر شعیب سلطان کا بھرپور استقبال کیجئے۔

ڈاکٹر شعیب سلطان: مہمانانِ گرامی! میں اپنے دوستوں کا بہت شکر گزار ہوں۔عارف صاحب کا بطورِ خاص کہ انہوں نے مجھے یہ اعزاز بخشا۔اس کے لیے میں ان کا انتہائی ممنون ہوں۔نعمان صاحب کی طرف سے جب مجھے دعوت نامہ ملا تو میں سوچنے لگا کہ میں بھلا کس طرح اپنے جذبات اور

ڈاکٹر شعیب سلطان اپنی یادداشت پیش کرتے ہوئے

خیالات کا اظہار کر پاؤں گا۔ کیونکہ وہ میرے لیے بہت قابلِ احترام ہیں اور میں نے انہیں ہمیشہ اپنے اتالیق اور استاد کے طور پر دیکھا ہے۔یہی سوچتا رہا کہ میں اختر حمید خان جیسی عظیم شخصیت کے ساتھ کس طرح انصاف کر سکتا ہوں۔

میرا ان کے ساتھ تعلق واقعی ایک گرو اور چیلے کا سا رہا ہے۔ ان کی موجودگی میں مجھ پر عزت و احترام کی ایک ہیبت طاری ہو جاتی تھی جو کسی ڈر خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی فکری برتری کی وجہ سے ہوتی۔جس کی وجہ سے مجھے کچھ کہتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس ہوتی۔ان کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے ایک بونا انسان کسی جن کا تعارف کرا رہا ہو۔

میرا اختر حمید خان صاحب سے تعلق بوزول کے ڈاکٹر جانسن کے ساتھ تعلق جیسا تھا۔میں زیادہ سے زیادہ اس عظیم انسان کے ساتھ اپنے تعلقات کی روداد، زندگی اور تاریخ بیان کرسکتا ہوں لیکن ان کی فطری خوبیاں ان کی ذہانت، ان کا ویژن، ان کی علمی گہرائی، ان کی فہم وفراست، ان کے عالمی مذاہب کے موضوع پر علمی دسترس، ان کا صوفی سلسلہ، ان کی بدھ مت کے پیروکاروں سا طرزِ زندگی، ان کے اسلام اور قرآن پر علمی احاطہ، ان کا علمی کام، ان کی شاعرانہ ترنم، ان کا اپنے خاندان کے ساتھ پیار ومحبت اور ان سب سے بڑھ کر ان کا پریشان حال انسانیت کی خدمت کرنے کا مشن اور اپنے اہل وطن کو اپنے تجربات سے فائدہ پہنچانے کا جذبہ، ان سب کو احاطہ کرنا میرے بس سے باہر ہے۔ میں نے ان کی شخصیت اور زندگی کے کچھ پہلو بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو اتنا ہمہ جانب اور مکمل تھا کہ شیکسپیر کے الفاظ میں" قدرت کھڑی ہو کر پوری دنیا کو بتا دے کہ یہ تھا ایک انسان"۔اختر حمید خان ایک مکمل انسان تھے، ان کا نعرہ بہت سادہ تھا، اعلی سوچ کے ساتھ سادہ زندگی گزارنا!

جب میں نے ان سے پوچھا: آپ نے انڈین سول سروس سے استعفی کیوں دیا؟ تو اس عمومی تاثر کے برخلاف کہ انہوں نے انگریزوں کی کالونی ازم جیسی حکومت کی پالیسیوں کے خلاف احتجاجاً استعفی دیا ہے ۔وہ بولے کہ انہوں نے انگریزوں سے بہت کچھ سیکھا اور اب احساس ہوا کہ انگریزوں کے پاس انہیں سکھانے کیلیے مزید کچھ بھی نہیں ہے ۔برطانیہ والے پبلک بریٹانیکا کے انتظام کو قائم کرنے میں تو ماہر تھے، لیکن ان کے پاس غربت زدہ انسانیت کے دکھوں کا مداوا کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔اختر حمید خان نے غریبوں کے مسائل کو سمجھنے کے لیے نہایت اہم ملازمت یعنی سول سروس کو چھوڑ دیا لیکن وہ انگریزوں کے مداح تھے اور کہتے تھے کہ انہوں نے خیالات اور طرز زندگی کا احترام کیا اور ان کی ذاتی زندگی میں کبھی مداخلت نہیں کی۔

اختر حمید خان ایک مزدور بنے اور ایک تالہ بنانے والے کے ہاں مشاہدہ کار کے طور پر ملازمت کی۔ڈاکٹر صاحب بتاتے تھے کہ ایک دن انہیں احساس ہوا کہ اللہ نے انہیں مزدود بننے

کیلئے خلق نہیں کیا ہے ۔تب وہ جامعہ ملیہ دہلی چلے گئے جس کے سربراہ ڈاکٹر ذاکر حسین تھے جو بعد میں انڈیا کے صدر بنے لیکن اختر حمید خان کسی حد تک مایوسی کا شکار تھے جیسے علامہ مشرقی تھے ۔ اختر حمید ایک امن پسند انسان تھے ۔وہ گوتم بدھ کی امن کی تعلیمات کے پیروکار تھے،نہ کہ جنگ کے ۔ وہ جرمن فلسفی نطشے کے ہیرو کو ناپسند کرتے تھے ۔ڈاکٹر صاحب بذاتِ خود ایک امن پسند انسان تھے ۔ وہ پاکستان میں ہیرو پرستی سے مایوس تھے ۔کبھی کبھار وہ موجودہ پاکستان کو رنجیت سنگھ کی خالص سرکار کے ساتھ موازنہ کرتے جب اس کی فوج لال قلعہ پر اپنا پرچم نصب کرکے فخر کرنے کا سوچتی ۔ مہاراجہ اپنی پگڑی فوجی سرداروں کے قدموں میں ڈال کر ان کو مہم جوئی کرنے اور برطانوی فوج سے مڈ بھیڑ ہونے سے تو روکتے رہتے ۔رنجیت سنگھ کی وفات کے فوراًبعد احساس برتری کا شکار خالصہ نے انگریزوں سے لڑائی مول لی اور اپنی سکھ سلطنت سے ہاتھ دھو بیٹھے ۔

اختر حمید خان سے میری پہلی مرتبہ شناسائی اپنے ایک بنگالی دفتری ساتھی کے چھوٹے بھائی کے توسط سے ہوئی ۔ یہ 1956 کی بات ہے کہ جب میں اسسٹنٹ مجسٹریٹ اور کلکٹر کے طور پر زیر تربیت تھا۔اس لڑکے نے مجھے بہت فخریہ بتایا کہ کومیلا میں ان کے کالج کا پرنسپل ایک ایسا شخص ہے جس نے عزت ووقار والی انڈین سول سروس سے استعفیٰ دیا ہے اور یہ کہ وہ بہت سادہ طبیعت والا انسان ہے اور ہر وقت گھر پر بنے ہوئے کپڑے کا لباس پہنتے ہیں ۔میں نے اس کی تمام باتوں کو ایک نوجوان کی بچکانہ باتیں جان کر توجہ نہ دی ۔

تین سال بعد سال 1959 میں میرا اختر حمید خان سے آمنا سامنا ہوا ۔انہوں نے کومیلا اکیڈمی کے فیکلٹی ممبران کو فیلڈ اور ینٹیشن کی تربیت دینے کیلئے میرے سب ڈویژن کا انتخاب کیا تھا مجھے معلوم تھا کہ جن چیزوں کو اکیڈمی کے تدریسی اسٹاف برہمن باریا میں دیکھیں گے وہ خوردبینی نگاہ سے زیرِ غور آئیں گے ۔میں نے ان کی فیکلٹی کے اجلاسوں کی کاروائی پڑھ لی تھی ۔اس لئے مجھے اس وقت خوشی ہوئی جب اختر حمید خان صاحب نے تعارف کے بعد بتایا کہ آپ کا بہت محتاط انداز

سے جائزہ لیا گیا تھا جونہایت کامیاب ثابت ہوا۔ برہمن باریا سٹیشن پر وہ نہایت اکھڑ طریقے سے غائب ہو گئے ۔انہوں نے مجھے اپنی کرائے پر حاصل کردہ جیپ میں سٹیشن تک چھوڑنے کی بھی رعایت نہیں دی ۔لیکن اس اتفاقیہ ملاقات کے بعد بہت دفعہ اکیڈمی جانے کا موقع ملااور ایک سال سے زیادہ عرصے کے بعد اختر حمید خان صاحب کی درخواست پر سکریٹری مشرقی پاکستان نے ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر (ڈیولپمنٹ) کے لیے ایک تربیتی کورس کا انتظام کرنے کیلئے مجھ سے کہا۔ میں یہ دیکھ کرانتہائی شرمندہ ہوا کہ اختر حمید خان خود مجھے لینے ریلوے اسٹیشن آئے اور اپنی میز بانی میں مجھے ابھونی آشرم تک چھوڑنے آئے جو اس وقت کومیلا اکیڈمی کا رہائشی مقام تھا۔ مجھے گیسٹ ہاؤس لے جایا گیااور بتایا گیا کہ اس سے پہلے یہاں جوشخص رہتا تھا وہ 15 سال تپ دق کے طویل مرض میں مبتلا رہنے کے بعد فوت ہوگیا ہے ۔میں یہ سوچ کر ڈر سا گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک ہفتہ اس کاٹیج میں رہنے کے بعد مجھے بھی یہ بیماری لگ جائے ۔اختر حمید خان صاحب نے میری پریشانی بھانپ لی اور کہا کہ فکرمند ہونے کی بات نہیں ۔اس بات کو کئی سال گزر چکے ہیں ۔جس کے بعد اس کاٹیج کو اچھی طرح جراثیم سے پاک کیا گیا ہے ۔اگر چہ میں نے تربیتی پروگرام اور اس کے انتظامی ڈھانچہ تیار کرنے میں مدد کی لیکن بدقسمتی سے میں خود تربیتی پروگرام میں شرکت نہ کرسکا۔اس کے بعد لاہور میں ہماری کئی بار ملاقات ہوئی جس میں ہر بار مجھے بھاگ جانے کا طعنہ سننا پڑتا۔

1971 میں ایک عشرے کے بعد مجھے اس وقت کومیلا جانے کا موقعہ ملا جب میں کومیلا پروجیکٹ کے مطالعاتی دورے کے گروپ میں شامل تھا ۔ اس مطالعاتی دورے کا مقصد Pakistan Academy for Rural Development (PARD) کے زیر سرپرستی مغربی پاکستان کے ترجیحاتی ڈسٹرکٹ پشاور میں اسی طرز کا ایک پروجیکٹ چلانا تھا۔ یہ ٹیم ڈائریکٹر، ڈپٹی کمشنر اور PARD فیکلٹی کے ایک ممبر پر مشتمل تھی میں اس وقت ڈپٹی کمشنر تھا۔ہم نے اختر حمید خان صاحب سے ملاقات کی جو اس وقت 20 تھانوں کے دورہ کی ایک تفصیلی

رپورٹ لکھنے میں مشغول تھے ۔مجھے اپنے سب ڈویژن کو دیکھنے کا شوق تھا اور اختر حمید خان صاحب نے بھی اس کے لئے میری حوصلہ افزائی کی۔ یوں میں نے اپنے سب ڈویژن کا دس سال بعد دورہ کیا تو سریال، برہمن باریہ اور قبضہ تھانہ مجھے کوئی دوسری دنیا ہی معلوم ہوئے۔ دس سال کے عرصے میں پورے دیہات کا نقشہ بدل چکا تھا۔ وہاں سڑکوں کا شاندار جال بچھا ہوا تھا اور ہر طرف نئے طرز کے بازار تھے ۔ پیداوار بکثرت تھی اور تھانہ مراکز زندگی کی بھرپور سرگرمیوں میں جھوم رہے تھے ۔خود برہمن باریہ تھانہ جہاں تحصیل آفس بھی تھا وہاں کا ڈیولپمنٹ سینٹر نئی ٹیکنیک سیکھنے اور ادارے سے خدمات لینے والے لوگوں سے یوں بھرا ہوا تھا کہ تھانہ مرکز کے اس طرح سے متحرک ،موثر اور فائدے مند ہونے پر لازمی حیرت ہوتی تھی۔ کومیلا میں جب میں نے اختر حمید خان سے مشورہ مانگا تو انہوں نے صاف گوئی سے کہا کہ مجھے پشاور ڈسٹرکٹ کے ایک تھانے کو منتخب کر کے اسے ماڈل کے طور پر ترقی دینا چاہیئے تاکہ اسی ماڈل کو ملک کے باقی تمام علاقوں میں رائج کیا جائے۔ ہمارے مغربی پاکستان واپسی کے بعد مارچ 1971 کے بعد ہونے والے واقعات اور میری پشاور سے پوسٹنگ ہونے کی وجہ سے پورا منصوبہ ٹھپ ہو کر رہ گیا۔

اکتوبر 1972 میں میں اپنے دوست طارق صدیقی سے (جن کی ذہانت کی اختر حمید خان صاحب بھی تعریف کیا کرتے تھے) مجھے معلوم ہوا کہ اختر حمید خان صاحب چیف منسٹر صاحب کی دعوت پر پنجاب کا دورہ کر رہے ہیں ۔میں نے خواہش ظاہر کی کہ اگر ممکن ہو تو اختر حمید خان صاحب ہمارے ہاں بھی آجائیں ۔ چند دن بعد وہ پشاور پہنچ گئے وہ اپنے پنجاب کے تجربے سے .بہت مایوس تھے ۔ درحقیقت وہ اس وقت مکمل مایوسی کا اظہار کر رہے تھے ۔میں نے انہیں داؤدزئی مرکز کا دورہ کرایا۔ وہاں انہوں نے جو کچھ دیکھا اس پر خوشی کا اظہار کیا لیکن اب بھی کچھ خدشات کا اظہار کر رہے تھے کہ معلوم نہیں صوبے کے پالیسی ساز اس قسم کے کام پسند کریں یا نہ کریں اور اسے جاری رہنے دیں یا درمیان سے ختم کرا دیں ۔میں نے انہیں ہر ممکنہ طریقے سے یقین دہانی کی کوشش

کی کہ اس صوبہ کی صورتحال تو یہی ہے اور میں یہ سب کچھ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ یہاں کی بیوروکریسی اور سیاست دونوں طرح کے لوگ اس پروگرام سے تعاون کر رہے ہیں۔ میں نے چیف سیکریٹری اور گورنر سے ان کی ملاقات کا بندوبست کیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جس وقت وہ گورنر سے ملاقات کے لیے گئے تو اس وقت وہاں کابینہ کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ اس لیے اختر حمید خان صاحب کو وزیر اعلیٰ اور چند صوبائی وزرا سے ملاقات کا موقع ملا۔ ملاقات کے بعد بھی اختر حمید خان صاحب یقین نہیں کر پا رہے تھے اس لئے ان کا ردعمل یقینی طور پر مثبت نہیں تھا۔

وہ ابھی تک اس میں الجھے ہوئے تھے کہ پالیسی سازوں کو پروگرام سمجھ میں آیا ہے کہ نہیں۔ میرا جواب تھا کہ اس پروگرام پر جب ہمیں ان سے تعاون مل رہا ہے تو ان کی سمجھ بوجھ کی چنداں فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈاکٹر اختر حمید خان پھر بھی قائل نہیں ہوئے اور چلے گئے۔ مجھے ان کی رائے میں موجود ہشیاری کا اندازہ اس وقت ہوا جب چند روز بعد اکیڈمی کے ایک فنکشن میں گورنر نے سب لوگوں کے سامنے مجھ پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ کچھ سال پہلے سردارگڑھی میں ایک پروجیکٹ شروع ہوا تھا۔ سب کو وہاں لیکر گئے تھے اور اب وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ اسی طرح سے شعیب سلطان خان نے داودزئی تشکیل دی ہے اور سب کو وہاں بھی لے گئے ہیں۔

IRDP کو ایسی کمیٹی نے تشکیل دیا تھا جو گورنمنٹ نے 1972 میں بنائی تھی۔ جس میں اختر حمید خان وائس چیرمین تھے۔ لیکن IRDP کمیٹی کی رپورٹ پر روعمل کے بارے میں اختر حمید خاں صاحب افسوس کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ انہوں نے تو ایک آرکیٹکٹ کا منصوبہ پیش کیا تھا لیکن گورنمنٹ نے دیواروں اور بنیادوں کو چھوڑ کر صرف اس کا گنبد تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ ترقیاتی نظریہ پر بہت توجہ دیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ کشش ثقل کے قانون کی طرح اٹل ہے۔ اور ترقی کے اصولوں کے برخلاف کوشش کرنی ٹیڑھی دیوار بنانے کے مترادف ہے۔

اختر حمید خاں صاحب واپس آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے جو اس وقت صرف تسلی دینے والا

اندازہی لگ رہا تھا۔ بالآخر میں نے انہیں اس بات پر راضی کیا کہ وہ ملک سے باہر اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے سے پہلے ایک مرتبہ ہمارے پاس ضرور آئیں۔ مارچ 1973 تک مرکز تو اچھی طرح سے تشکیل پا چکا تھا لیکن ہم لوگ تقریباً ایک بند گلی میں تھے۔ مرکز کی تعمیر اور وہاں کی تعیناتی سے نہ تو کوئی ٹھوس نتائج نکل رہے تھے اور نہ ہی لوگوں پر ان کے کوئی اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ اصل بات بھی یہی ہے کہ میں جب بھی مرکز جاتا تو اسے ایک ویران جگہ پا کر میرا دل ڈوب جاتا تھا۔ اگرچہ یہاں کا دورہ کرنے والے ہماری تعریف کرتے ہماری حوصلہ افزائی کرتے لیکن میں دل میں سوچا کرتا کہ لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لیے ہمارے اصول کچھ بھی نہیں کر رہے تھے۔ اختر حمید خان صاحب آئے، اور حالات کا جائزہ لیا اور اگلے ایک سال میں اسے قابل عمل بنانے کے لیے ہمیں ایک منصوبہ بنا کر دیا۔ نہ صرف یہ کہ انہوں نے ہمارے لیے یہ کام کیا بلکہ ہماری بہت زیادہ حوصلہ افزائی کی اور ہمیں یقین دلایا کہ ہم ہم صحیح راستے پر ہیں اور یہ کہ جو مسائل ومشکلات ہمارے سامنے آرہے ہیں وہ اس بات کی حتمی دلیل ہیں کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے پشاور سے چلے جانے اور پھر باہر جانے سے پہلے انہوں نے مجھے ایک خط لکھا تھا کہ

"My stay at Peshawar was deligfhtful for me ,physically and intellectullay except that sometimes. I feel that your hospitality to me was excessive.I have told my friends here how you picked me up from the dustbin and used me. I shall remain deeply interested in the Daudzai Project.It is like an island of sincerity in a sea of hypocrisy"

ایک سال بعد انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا اور امریکہ سے واپس آئے۔ پشاور میں اختر حمید خاں بہت خوش تھے کیونکہ مشرقی پاکستان کے صدمے کے بعد انہیں اپنا کھویا ہوا مقصد مل گیا تھا۔ داودزئی پروجیکٹ کی ماہانہ ترقیاتی رپورٹوں کے مطالعہ نے انہیں مشی گن یونیورسٹی کے آرام و آسائش کو ترک کروایا اور جب میں نے انہیں ایک بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کے لیے دعوت دی جس کا بندوبست ہماری اکیڈمی کر رہی تھی تو انہوں نے امریکہ سے مستقل طور پر واپس آنے کی پیش کش کی۔ مگر اس شرط پر کہ وہ 1,500 روپے سے زیادہ ماہانہ تنخواہ نہیں لیں گے۔ میں نے اصرار کیا کہ آپ کو فیڈرل گورنمنٹ کے جوائنٹ سکریٹری کی تنخواہ کے برابر تنخواہ قبول کرنی ہوگی جو اس وقت 2,100 روپے تھے بالآخر وہ مان گئے۔ پشاور میں انہیں اپنے پرانے دوست ملے بالخصوص پروفیسر درانی جو انجینئرنگ کالج میں تھے۔ خان صاحب ان سے بحث و مباحثہ کرتے اور ان کی روحانیت کے دعووں کو بے نقاب کرتے لیکن درانی صاحب ہمیشہ ان کی ان باتوں کو ہنسی میں اڑا دیتے۔ ایک مرتبہ میں نے درانی صاحب سے پوچھا کہ وہ اختر حمید خاں صاحب کے اعتراضات کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ وہ ہنس دیئے اور اعتماد کے ساتھ بولے کہ جب وہ اختر حمید خان کو غصے میں دیکھتے ہیں تو انہیں ان پر اسی طرح پیار آتا ہے جسے ایک چھوٹے بچے پر پیار آتا ہے اور اس وقت ان کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ وہ خان صاحب کو ایک معصوم بچے کی طرح گلے لگائیں۔

میری بیگم مسرت نے انہیں اپنے امریکہ میں گزارے ہوئے دنوں کی ڈائری اردو میں شائع کرانے پر آمادہ کیا اور اس کا دیباچہ بھی خود لکھا، جس سے خان صاحب بہت لطف اندوز ہوئے کیونکہ انہوں نے لکھا تھا کہ کچھ لوگوں کو خان صاحب فراڈ لگتے، کچھ لوگوں کو وہ ایک روحانی بزرگ لگتے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک مکمل انسان تھے۔

داودزئی کی وسیع پیمانے پر تعریفیں ہوئیں، خاص طور سے غیر ملکیوں اور بیرون ملک سے امداد دینے والی ایجنسیوں کی طرف سے۔ داودزئی پروجیکٹ کے دورے کے بعد Edgar

Owens نے مجھے لکھا:

"Thanks to you,there is at least one good rural project in Pakistan. How do we persuade the President and Prime Minister to make a Daudzai the basis for nation-wide rural development.when someone can answer that question .one begin to believe again in a better future for all of us

داودزئی پروجیکٹ کی کامیابی اورشہرت نے لوگوں کے کچھ طبقات میں حسد اور دشمنی کو ختم کر دیا۔ پاکستان رورل آف اکیڈمک ڈیولپمنٹ خفیہ سازشوں کا ٹارگٹ بننے لگا،اور کبھی کبھار اس کے خلاف کھلا پروپیگنڈا کیا جانے لگا کہ یہ صرف ایک صوبائی اکیڈمی ہےاور یہ صرف NWFP کو خدمات فراہم کررہی ہے ۔اصلی صورتحال کہ جس کی تائید متعلقہ اعدادوشمار بھی کررہے تھے ان الزامات کو بے بنیاد ثابت کیا لیکن اس کے باوجود اکیڈمی اور داودزئی پروجیکٹ کے کاموں کو غلط ثابت کرنے کی کوششیں جاری ہیں ۔اکیڈمی نے فیڈرل گورنمنٹ کی رورل ونگ کو بھرپور طور پر واضح کیا کہ وہ اصول جن کی بنیاد پر داودزئی پروجیکٹ بنا ہے وہ جتنا داودزئی کے علاقے کے لیے موزوں ہیں اسی طرح پورے ملک میں ہر جگہ موزوں ہیں ۔درحقیقت پروفیسر Guy Hunter نے Dawood Zai a case study پرتبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

the important point of principle which have been applied in Daudzai are revelant to the Rural Development project in almost any context ".

گائی ہنٹر نے اس کیس کی اسٹڈی کی 100 کاپیاں تقسیم کرادیں۔اور بعد میں اسے انگلینڈ سے

Agricultur Administrationنامی جرنل میں شائع کیا۔صوبے،خاص طور پر پنجاب اور سندھ نے پالیسی کی سطح پر (چیف سکریٹری وغیرہ) نے داود زئی پروجیکٹ میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا تھااور انہی خطوط پر اپنے صوبوں میں پروجیکٹ شروع کرانے کے امکان کا بھی اشارہ دیا تھا۔ اکیڈمی نے ہمیشہ دوسرے صوبوں کو بھی اپنی خدمات فراہم کرنے کی کوشش جاری رکھی تھی۔ درحقیقت اکیڈمی کے ڈائریکٹر نے لاہوراور کراچی کے بہت دورے کئے تھے تاکہ ان کو دیہی ترقی کے ضمن میں اکیڈمی کے طریقہ کار کو اپنانے کے لیے قائل کیا جاسکے۔لیکن یہ بات ماننی چاہئے کہ اکیڈمی صرف قائل کرانے کی کوشش کرسکتی تھی۔اکیڈمی کے پاس صوبوں کو مجبور کرنے کی اتھارٹی نہیں تھی۔فیڈرل رورل ڈیولپمنٹ ونگ نے بالاخر اکیڈمی کو اپنے IRD پروجیکٹ میں حوصلہ افزائی کرنے کی ضرورت محسوس کی۔لیکن افسوس تب بہت دیر ہو چکی تھی۔

تحصیل سطح کے زیرِتربیت ایک ناراض آفیسر کی طرف سے پیش کردہ سنگین شکایات پر (جسے اکیڈمی نے تربیتی کورس کے پانچویں ہفتہ میں تربیتی کورس میں دلچسپی نہ لینے اور فارغ بیٹھنے رہنے کی وجہ سے تربیتی پروگرام سے نکال دیا تھا) صوبہ سرحد کے نئے چیف سیکریٹری ا،اکیڈمی کے بورڈ آف گورنرز اور سابقہ چیئرمین نے ان کی اس الزام تراشی پر کہ اختر حمید خان اکیڈمی میں سندھو دیش تحریک کو ہوا دے رہے ہیں یہ کمنٹ لکھا:

"I am enclosing a copy of the explanation of Dr. Iftikhar Ali Khilji (Assistant District Health officer) for your consideration and comments. As you would notice he has made some telling observation and asked some leading question as regards what the Academy is doing and what some of its staff members are

saying. From the way he has questioned certain loyaties disputed certain bona fides, mentioned certain names, and criticized certain views, one would seriously wonder whether the Academy was serving its true purpose .you are indeed the right person to tell"

میں نے خود چیف سیکریٹری کو صورتحال کی وضاحت کر کے قائل کرنے کی کوشش کی۔اس کے بعد اختر حمید خان صاحب کی درخواست پر ان کا ایک انٹرویو بھی ہوا۔پھر اختر حمید خان صاحب کی طرف سے تحریری وضاحت بھی جمع کی گئی کہ یہ الزامات بے بنیاد ہیں ۔لیکن چیف سیکریٹری شاید ہماری نیک نیتی کا قائل نہیں ہوا تھا یا شاید ہو گیا تھا۔اس پر یقین سے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔8 اگست 1975 کو جب میں اپنی ڈاک کھول رہا تھا،

درج زیل الفاظ میرا منہ چڑا رہے تھے:

Notification No .812/75-AI dated 7thAugust 1975:

Mr. SHOAIB SULTAN KHAN, Director, Pakistan Academy for Rural Development, Peshawar, in Grade 20, is appointed as officer on Special Duty Establishment Division,Rawalpindi in his grade with immediate effect and until further order

پاکستان رورل اکیڈمی سے میری رخصتی کے نتیجے میں اختر حمید خان صاحب نے بھی اکیڈمی کے مشیر کے عہدے سے فوراََ استعفی دیدیا۔

انہوں نے اپنی بیگم کو مذاق کرتے ہوئے کہا کہ وہ واپس کراچی جارہے ہیں جہاں وہ اپنے

بھائی کے زیرتعمیر گھر میں مزدور کی حیثیت سے کام کریں گے۔خان صاحب اپنی بیگم کو تنگ کرنے کا کوئی موقعہ نہیں چھوڑتے تھے۔بہت دفعہ میں اور وہ خان صاحب کے خلاف اکھٹے ہو جاتے تھے۔وہ مجھے بتاتی رہتی تھیں کہ آپ ان کے سب سے زیادہ مخلص شاگرد ہیں۔اور آپ کی غیر موجودگی میں وہ آپ کے بارے میں بہت زیادہ فکرمندی اور خدشات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔

میں نے چیف سیکریٹری کو لکھا کہ آنے والی نسلیں ان لوگوں سے سوال کریں گی جو اس شرمناک کام کے ذمہ دار ہیں۔کیونکہ اس طرح انہوں نے اس صوبے کے غریب لوگوں کو غربت سے نکلنے کے موقع سے محروم کیا ہے۔وہ عظیم سماجی سائنس دان تھے جسے پاکستان نے پیدا کیا تھا۔ بلاشبہ ڈاکٹر صاحب اس صوبے کا اثاثہ تھے مگر کسی نے ان کی قدر نہیں کی۔اختر حمید خان کے مشی گن واپس چلے جانے پر مجھے شدید غم وغصہ ہوا کہ وہ ان لوگوں کے رحم وکرم کا شکار ہوئے جنہیں کچھ علم نہیں تھا کہ وہ کتنی بڑی شخصیت ہیں۔مجھے داؤدزئی پروجیکٹ کے طریقے کار کے ذریعے بغاوت کرانے کے الزام میں FIA کے ذریعے تفتیش کا سامنا کرنا پڑا اور جب ان بے بنیاد الزامات سے بری ہوا تو فیصلہ کیا کہ UN کی سرپرستی میں اپنی حفاظت کروں۔یوں ملک سے باہر چلا گیا۔

مجھے جاپان اور سری لنکا جانے کے مواقع ملے۔اس وقت تک اختر حمید خان صاحب پاکستان واپس آچکے تھے، اور مرحوم آغا حسن عابدی کے تعاون سے عالمی شہرت یافتہ اورنگی پائلٹ پروجیکٹ شروع کر چکے تھے۔اختر حمید خان صاحب نے عابدی صاحب سے اپنی پہلی ملاقات کے بارے میں بتایا کہ وہ چاہتے تھے کہ میں ایک عظیم الشان منصوبہ بناؤں جو BCCI کی متاثر ہوتی ہوئی حیثیت کے لیے ایک قابل قدر کوشش ہو۔اگلی ملاقات میں اختر حمید خاں نے OPP کا منصوبہ پیش کیا اور عابدی صاحب کی طرف سے لاکھوں روپے کی پیش کش میں سے چند ہزار روپے کا تقاضا کیا۔عابدی صاحب نے اختر حمید خان صاحب کے منصوبے سے اتفاق کرلیا۔

اختر حمید خان صاحب چاہتے تھے کہ میں واپس آجاؤں اور ان کے ساتھ OPP میں کام

کروں۔ مجھے انٹرویو کے لئے بلایا گیا، جس میں اختر حمید خان صاحب بھی ساتھ تھے، جنھوں نے مجھ سے عابدی صاحب کا رسمی تعارف بھی کروایا تھا۔ اسی دوران آغاخان فاؤنڈیشن (AKF) رابرٹ شانے اختر حمید خان صاحب سے رابطہ کیا اور ان سے پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں آغاخان رورل سپورٹ پروگرام (AKRSP) شروع کرنے کے لیے ایک مناسب شخص کی ضرورت کا اظہار کیا۔ میری دعوت پر اختر حمید خان صاحب سری لنکا آئے اور مجھے پاکستان واپس جانے کے لیے کہا۔ ایک مرتبہ میں چوٹ کھا چکا تھا اسی لیے میں نے اپنے دونوں خیر خواہوں یعنی BCCI اور AKF کو کہا کہ یونیسیف (سری لنکا) میں میری خدمات وک ڈیپوٹیشن پر حاصل کرنے کیلئے کہا جائے۔ آغا حسن عابدی اور ہز ہائی نس آغا خان دونوں نے یونیسیف کے اگزیکیٹیو ڈائریکٹر جیمس غرانٹ کو خط لکھا۔ چونکہ یونیسیف کا آغاخان فاؤنڈیشن کے ساتھ اشتراک عمل تھا شاید اسی لیے ان کے ساتھ میری پانچ سال کی ڈیپوٹیشن منظور ہوگئی۔ اختر حمید خان صاحب بہت خوش ہوئے۔ مجھے OPP بلانے کا واحد مقصد مقامی سرکاری اہلکاروں سے نمٹنا تھا، کیونکہ بقول ان کے دور کے سرکاری عہدہ داروں کی جگہ نئے لوگ آگئے تھے جنہیں وہ گھٹیا و حقیر کہا کرتے اور ان کا خیال تھا کہ میں ان سے نمٹنے کے لیے زیادہ موزوں ہوں۔ بعد میں انہیں تسنیم احمد صدیقی، عارف حسن اور پروین رحمان جیسی بہترین ٹیم ملی جو اس کے جھنڈے کو نہ صرف کراچی میں بلکہ آج تک پاکستان کے بہت سارے شہروں اور باہر کے ممالک میں بھی لہرارہے ہیں۔

میرے شمالی علاقہ جات میں قیام کے دوران اختر حمید خان صاحب نے بارہ دورے کیئے اور جہاں تک میں نے پڑھا اور دیکھا ہے، ان کی یہ بارہ رپورٹیں تخفیف غربت کے موضوع پر دنیا کی بہترین درسی کتاب ہے۔ جب انھوں نے اپنے پہلے دورے کے موقعہ پر مجھے کہا کہ میں کومیلا اور داودزئی کو بھول جاؤں تو مجھے سخت حیرت ہوئی۔ پچھلے دو پروگراموں کو حکومت نے چلایا تھا اور تعاون کیا تھا لیکن AKRSP میں اس کے فوائد و نقصانات دونوں موجود نہیں تھے۔ کومیلا اور

داؤد زئی دونوں معاملات میں گورنمنٹ پر انحصار سے پیدا ہونے والی غیر مستقل مزاجی موجود تھی۔ اگرچہ فکری نظریہ یعنی تنظیم سازی انسانی صلاحیتوں کی ترقی اور بچت کے ذریعے سرمایہ سازی میں تو کوئی تبدیلی نہیں ہوئی لیکن یہاں گورنمنٹ کو ایک ایسے معاون ادارہ کے ذریعے تعاون فراہم کرنا تھا جو آزاد اور خودمختار ہو اور اس کے پاس مناسب وسائل بشمول انسانی وسائل، تکنیکی وسائل اور مالیاتی وسائل موجود ہوں۔ انہوں نے AKRSP کو اس Joint Commission for Relief and Reconstruction(JCRR) کی طرح قرار دیا جیسے امریکیوں نے کمیونسٹوں کے ہاتھوں kumantang کی شکست کے پس منظر میں تائیوان میں تشکیل دیا تھا۔ ایک وسیع تر پس منظر میں انہوں نے مجھے منٹگمری کے مشابہ قرار دیا جس نے حملہ کرنے سے پہلے وسیع وسائل جمع کیے تھے۔ وہ ہمیشہ بڑی تنخواہ اور اسراف کی مذمت کرتے رہتے تھے، جبکہ میں انہیں ہر وقت دوسروں کے حق میں زیادتی کرنے والے اور دوسروں کے بارے میں بے حس قرار دیا کرتا تھا جو ان کی طرف سے ملنے والی پانچ ہزار روپے ماہوار تنخواہ میں گزارا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ دوسروں کے بارے میں تو نرمی کا مظاہرہ کرتے تھے لیکن اپنے بارے میں کوئی نرمی نہیں دکھاتے تھے۔ جسمانی تکالیف کے باوجود وہ ہمیشہ شمالی علاقہ جات دورے کے لیے تیار رہتے تھے۔ شمالی علاقہ جات کی تکلیف دہ اور خطرناک سڑکوں پر سفر کرنے کے علاوہ جب موسم کی خرابی کے باعث فلائیٹ ملتوی ہو جاتی تو وہ 600 کلومیٹر سے زائد طویل شاہراہ قراقرم پر سفر کرنے میں ایک لمحے کی دیر نہیں لگاتے تھے۔ وہ گائی ہنٹر کے اس تبصرے کو ہمیشہ دہرایا کرتے تھے۔ جسے انہوں نے AKRSP کے دورہ کے موقعہ پر کہا تھا کہ یہ کوئی دیہی ترقی کا پروگرام نہیں بلکہ یہ بہادروں والا پروگرام ہے۔

OPP میں پورے طور سے شمولیت کے باوجود ان کا دل بھی دیہی ترقی میں لگا ہوا تھا۔ شاید ایسے موقعوں کے لیے ہی کہا جاتا ہے کہ چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ در

حقیقت انہوں نے نوے کی دہائی کے ابتدائی سالوں میں مجھے نیشنل رورل سپورٹ پروگرام (NRSP) سے ایک چھوٹا سا گرانٹ دیا تا کہ کراچی کے اطراف میں پھیلے ہوئے دیہی علاقوں میں ایک دیہی ترقی کا پروجیکٹ شروع کیا جاسکے۔اس کے لیے اپنے بیٹے اکبر کو کنیڈا سے واپس بلایااور راسے OPP کے دیہی ترقی کے حصے کا انتظام سنبھالنے پر آمادہ کیا۔

AKRSP کے دوروں کے دوران وہ فیلڈ اسٹاف اور کمیونٹی کے کارکنوں کے ساتھ گھنٹوں گزارتے اور دیہی علاقوں کی صورتحال کی تہہ تک پہنچ جاتے۔جتنی بار میں ان کے پاس گیا ہمیشہ مجھے کوئی نئی چیز سیکھنے کو ملتی ۔وہ حقیقت میں ایک چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا تھے۔ان کا علم بے کراں تھا۔سری لنکا کے ایک دورے کے دوران جب انہوں نے مجھے ایک بدھسٹ مونسٹری جانے کے لیے کہا تھا کہ وہ ایک بدھسٹ مونک سے ملاقات کریں،اس وقت اس نے دھرمہ پداکو اصلی پالی زبان میں پڑھ کرسب کو حیران کر دیا،جو اس مونک کو بھی سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ ان لوگوں نے توصرف سنہالی زبان میں اس کا ترجمہ سیکھا ہوا تھا۔وہ مجھے انتباہ کرتے رہتے تھے کہ کبھی بھی مذہب کی شدت پسند کتابوں تک نہیں جانا چاہیئے۔آپ یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ توجیہ کرنے والوں نے اصل مذہبی تعلیمات کو کیا سے کیا بنا دیا ہے اور اگر آپ نے ان کی باتوں کو چیلنج کیا تو وہ جارحانہ انداز میں آپ سے لڑیں گے۔یوں اپ کو اپنی عزت بچانے کیلئے پسپائی اختیار کرنی پڑیگی۔ وہ گوتم بدھ کی تعلیمات سے بہت متاثر تھے،اور اکثر اپنے آپ کو ایک بدھسٹ مسلمان کہتے تھے۔ وہ گوتم بدھ کی طرح دنیوی خواہشات کو ترک کر دیتے لیکن وہ کہتے تھے کہ میں اپنی فیملی سے بہت پیار کرتا ہوں۔میں انہیں نہیں چھوڑ سکتا۔لیکن پریشانیوں میں وہ ہمیشہ گوتم بدھ کے اس قول کا سہارا لیتے کہ یہ دنیا دھوکے سے بھری ہوئی ہے۔

AKRSP کو ایک طرف آغا خان جیسا بانی اور حوصلہ افزائی کرنے والا ملا تو دوسری طرف رہنمائی کے لیے اختر حمید خان جیسا استاد اور معاون بھی ملا۔ AKRSP اس وقت شروع ہوا تھا

جب اختر حمید خان صاحب اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہر وہ پروگرام جو بیرونی امداد اور تعاون پر انحصار کرتا ہو وہ پائدار نہیں ہو سکتا۔ وہ کومیلا کو چین کے کمیون سسٹم سے موازنہ کرتے اور انہیں ان دونوں میں جو فرق واضح طور سے نظر آیا وہ بیرونی وسائل پر انحصار اور خود انحصاری تھیں۔ آخر کار وہ اورنگی پائلٹ پروجیکٹ میں ترقیاتی کاموں کے لیے مقامی وسائل پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ جب وہ پہلی مرتبہ گلگت آئے تو اس وقت میں کمیونٹی کے لیے ایک ترقیاتی منصوبے میں شریک تھا اور اس کی سبسڈی پر کام کر رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے اس کام پر مجھے ڈانٹ پلائی۔ وہ خفا بھی ہوئے۔ کیونکہ بھاری سبسڈی کی وجہ سے کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان کا اصرار تھا کہ لوگوں کو اپنے ترقیاتی کاموں پر عمل درآمد کیلئے خود سے وسائل پیدا کرنے چاہیئے اور اگر ان کے پاس وسائل نہ ہوں تو قرض لینا چاہیئے نہ کہ عطیات۔ لیکن جب میں انہیں یہاں کے چند گاؤں میں لے گیا تب انہوں نے خود دیکھ لیا کہ کراچی یا اورنگی کے برعکس شمالی علاقہ جات کے گاؤں میں رہنے والوں کے پاس نہ تو کوئی مستقل آمدنی کا زریعہ ہے اور نہ ملازمتوں کے مواقع ہیں تو انہوں نے تھوری سی نرمی دکھائی اور AKRSP کے ہر گاؤں کو آمدنی بڑھانے والی اسکیم کے لیے عطیہ دینے کی پالیسی سے اتفاق کیا لیکن وہ بھی صرف ایک بار کے لیے تھا، جس سے نہ صرف ان کی آمدنی میں اضافہ ہوگا بلکہ ان کی عوامی سطح کی ادارہ سازی میں سرمایہ ساری بھی ہوگی۔ یوں ورلڈ بینک کی دو تجرباتی رپوٹوں کے مطابق اختر حمید خان صاحب کی رہنمائی میں جامع طریقہ کار اپناتے ہوئے AKRSP دس سالوں کے اندر لوگوں کی آمدن میں دوگنی ترقی کرانے میں کامیاب ہوا۔

بدقسمتی سے جب اختر حمید خان صاحب کی خود انحصاری کے ویژن کو ایک جامع طریقے سے AKRSP کے ذریعے علمی جامہ پہنانے کا وقت آیا تو جنیوا والے یہ سمجھے "terra Incognita" AKRSP کے مقام پر پہنچ چکا ہے، اور یوں انہوں نے اس کے لیے نئی راہوں کی تلاش شروع کر دی۔ اختر حمید صاحب کے مشورے کو فالتو اور "پرانا پڑھا ہوا سبق" کہہ کر

ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا، اورتخفیف غربت کیلئے ایک خود انحصاری اور پائدار دیہی ترقیاتی پروگرام کی تشکیل کا موقعہ ہاتھ سے چلا گیا۔ڈاکٹرحمید خان صاحب بہت اداس ہوگئے اور میں جنیوامیں موجود لوگوں کی اعلیٰ ذہانتوں کے آگے بےبس ہوگیا اور UNDP کی طرف سے AKRSP تجربےکوجنوبی ایشیا تک توسیع دینے کی پیش کش کو قبول کرلیا۔

میں نے اختر حمید خان صاحب کو National Rural Support Program (NRSP) میں دلچسپی لینے کے لیےکوشش کی ۔شروع میں وہ مجھے انڈومنٹ فنڈ کے لیے 500 روپےملین فنڈ لینے پرشک کی نگاہ سے دیکھتے تھےجو میں نے NRSP کے لیے حکومت سے لیے تھے۔وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ پاکستان میں نہ تو کوئی حکومت ہےاور نہ ہی کوئی حکومتی نظام۔وہ پاکستانی حکومت کو دانتے کے جہنم کی طرح قرار دیتے تھے،جس کے دروازے پر یہ لکھا ہوتھا:Abandon all hope, Ye who enter here (تمام امیدوں کو ترک کرکے یہاں داخل ہو)کسی حد تک ہچکچا ہٹ کے ساتھ انہوں نے باقاعدگی سے NRSP کا دورہ کرنا شروع کیا اور یہ کہہ کرحوصلہ افزائی کی:

"NRSP is a great national asset.it is our hope. I also tell you it is not an easy job"

ان کے حکومت کے ساتھ دعوت کھانے کے خطرے کے بارے میں خدشات اس وقت سامنے آئے جب اس وقت کی حکومت نے NRSP کی دی ہوئی 500 ملین کی رقم واپس لینا چاہا۔خوش قسمتی سے اختر حمید خان صاحب کے مشورے پر اس رقم کو انڈاومنٹ فنڈ میں تبدیل کر دیا گیا تھااور جب حکومت نے مطالبہ کیا کہ تمام ڈائریکٹر استعفی دیدیں اور کمپنی کو ختم کریں تو اختر حمید خان نے(جوخود بورڈ کے ممبر تھے)تمام بورڈ ممبران کو اس وقت کے NRSP کے اسٹاف کے بارے میں اپنی اخلاقی ذمہ داری یاد دلائی ۔یوں سب نےکمپنی کو بند کرنے کےخلاف ان کی

رائے کا ساتھ دیا۔

ایک مرتبہ جب میں نے ان سے پوچھا کہ کیا میں بھی ان کی طرح کام کرنے کے لیے انہی کی طرح کھدر پہن لوں؟ انہوں نے جواب دیا کہ آپ کو بہروپیا بننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لوگوں کی ذہانت کی توہین مت کیجئے۔ آپ کسی بھی لباس میں ہوں۔ وہ آپ کی حقیقی قدر و قیمت جان لیں گے شمالی علاقہ جات میں وہ مجھے یاد دلاتے رہتے تھے کہ میرا قیمتی لباس یا ہیٹ پہننا یا ہیلی کاپٹر سے سفر کرنا غریب لوگوں کو میری اصلی قدر و قیمت کو پہچاننے میں کوئی فرق نہیں ڈالتا ہے۔

میرے AKRSP سے الگ ہونے کی وجہ سے وہ سخت افسردہ تھے کہ پاکستان کے لیے یک خود انحصار ترقیاتی ماڈل تشکیل دینے کا ایک اور موقعہ ہاتھ سے چلا گیا۔ میں AKRSP میں ان سے ہونے والے ریگولر رابطے کی کمی کو شدت سے محسوس کرتا تھا۔ انہوں نے زیادہ سے زیادہ اربن ڈیویلپمنٹ پر توجہ دینی شروع کی۔ اور جب میں ان کی بیگم کے ساتھ مل کر ان سے مجھے وقت نہ دینے کی شکایت کرتا تو انہوں نے اس بات پر خفگی کا اظہار کیا کہ میں ملک کے اندر قابل تقلید ماڈل بنا کر انہیں توسیع دینے کے بجائے ہر وقت باہر کے ممالک میں گھوم پھر رہا ہوں۔ انہیں میری صحت کا بہت خیال رہتا تھا اور کبھی کبھار معصومانہ انداز میں پوچھتے تھے کیا تمہیں واقعی اتنے پیسے کمانے کی ضرورت ہے؟۔ انہیں یہ بات کبھی بھی یہ سمجھ نہیں آئی کہ پیسوں کی ضرورت مجھے اپنے لیے نہیں ہے بلکہ انکی طرح میں بھی اپنی فیملی سے بہت پیار کرتا ہوں، اور انہیں دنیا کی ہر چیز دینا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے ہاتھیوں کے ملک سری لنکا کے مہاویلی جنگل میں ایک ایسے چھوٹے سے کمرے میں زندگی گزارتے دیکھ چکے تھے جہاں دنیا کی کوئی سہولت موجود نہیں تھیں یا پندرہ سال تک گلگت کے ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں زندگی گزارتے دیکھ چکے تھے۔ بہر حال مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ انہیں نئے شاگرد ملنے شروع ہوئے تھے، اور 1983 کی ایک تقریر میں انہوں نے جو شکایت کی تھی وہ دور ہو چکی تھی:

"Nowadays there is a curious reluctance,especially among the younger generation to understand and learn .Everyone seems to think he is a master .It is strange because Master are not born. What my senior friends dismissed as my charisma was an acquired skill. A skill acquired after a long period of apprenticeship under British, Gandhian and American master, a skill further sharpened by the study of many successful models in other countries- Japan, Taiwan, Yugoslavia, China, India and Israel. I never felt ashamed of my long and multiple discipleship. I never pretended to be an original thinker.I thought I could teach after I had devoted much time and labour to learning from many sources.When Iwas young I accepted the wise precepts of Khawaja Hafiz *"Nasihat gosh Kun janan ki as jan dost tar darand javanan -i-saadatmand pindi -piri-dana ra".*

As I grew old I began to think perhaps wrongly that I have not grown old in vain,that throughout my long life, I have been a good student; therefore,in my old

age I could be a good teacher. In my delusion I thought that at last I too had become a *pir-i-dana,* a wise old man and I could give guidance to *jawanan-i-saadatmand* enlightened young men. Alas, in twenty years, only one enlightened young man Shoaib Sultan Khan cherished me as a worthy teacher. He applied my methods, of course with necessary modifications, first in Daudzai and then in Mahaveli, and now he is applying them with further refinement in Gilgit. He has definitely disproved the obscurantist charisma theory. is it my fault that I found only one enliightened, young man"?

ان کی انکساری کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ ان کے چار سے زیادہ شاگردوں کو Magsaysey ایوارڈ مل چکا ہے ۔شاید Magsaysey ایوارڈ مل فاونڈیشن کی تاریخ میں ایک ریکارڈ تھا۔ اختر حمید خان صاحب نے یہ ایوارڈ 1963 میں حاصل کیا تھا۔

اورنگی پائلٹ پروجیکٹ پر عمل درآمد کے دوران انہیں عارف حسن مل گئے۔جنہوں نے کم خرچ سیوریج اور سینیٹیشن کے ایک نظام کی تخلیق کی ۔جس میں اندرونی ترقیاتی کام کے اخراجات اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے باسیوں نے جو ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے ۔اپنی مدد آپ کے تحت برداشت کئے ۔تسنیم صدیقی نے اختر حمید خان کو ہاؤسنگ میں مدد فراہم کی اور Magsaysey ایوارڈ جیت لیا۔عارف حسن اور اختر حمید خان سے متاثر ہو کر پروین رحمان OPP کا ایک لازمی

حصہ بن گئیں۔ یہاں تک انہوں نے اپنی جان بھی قربان کر دی۔ڈاکٹر حمید خان صاحب 1983 تک یہی شکوہ کرتے تھے کہ انہیں صرف ایک شاگرد (شعیب سلطان) ہی ملا ہے لیکن اسے عارف حسن، تسنیم صدیقی اور پروین رحمان کے مثلث نے ان کے اس دنیا سے جانے سے پہلے ہی غلط ثابت کیا۔

وہ بہت خوش ہو کر بتایا کرتے تھے کہ ان کے انڈین سول سرونٹ کے ساتھی ان کے استعفیٰ دینے پر کہا کرتے تھے کہ انہوں نے بہت بڑی بے وقوفی کا ثبوت دیا ہے۔

میں نے انہیں ایک معصوم انسان پایا۔وہ ہر مرد وعورت کو ان کے ظاہری رویے پر قبول کر لیتے تھے جس کی وجہ سے انہی کئی بار مایوسی بھی ہوئی۔وہ کسی کے بارے میں بھی برائی کا نہیں سوچتے تھے،کیونکہ وہ خود انتہائی مخلص اور معصومیت سے بھر پور تھے۔میرے ایک رشتہ دار جو میرین چیف انجینیئر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے اور پاکستان آٹو موبائل کارپوریشن کے مینیجنگ ڈائیریکٹر بھی تھے میرے ذریعے ان سے متعارف ہوئے۔جلدی ہی انہوں نے اختر حمید خان صاحب کا دل جیت لیا یہاں تک کہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو اپنے جانشین کے طور پر تربیت دینے کا سوچا۔ڈاکٹر حمید خان صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اس لیے OPP کی خاطر اس سے جان چھڑانے کا فیصلہ کیا۔

اس ناانصاف اور ٹیڑھی دنیا میں برطرف شدہ ملازم آسانی سے اختر حمید خان صاحب کے خلاف جھوٹے اور بے بنیاد الزامات گھڑنے میں کامیاب ہوا۔ملتان اور کراچی میں ان کے خلاف توہین مذہب کے مقدمات درج کیے گئے۔ہم سب جانتے تھے کہ یہ جھوٹے الزامات ہیں۔ڈاکٹر طارق صدیقی نے تو مذہبی علما سے اختر حمید خان صاحب کے دفاع میں تحریری بیانات بھی لیے ان کے خلاف مقدمہ چلتا رہا۔ڈاکٹر عنایت اللہ نے اس ناانصافی کے خلاف اسلام آباد میں عوامی احتجاج کرایا۔فیاض باقر نے ملتان میں اپنے جاننے والوں سے رابطہ کیا۔

ایک بار میں وزیرِ اعظم صاحب کے ساتھ عشائیہ میں تھا تو اس موقع پر میں نے انہیں اختر حمید خان صاحب کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کے بارے میں بتایا۔ وزیر اعظم ان سے ملاقات کے لئے راضی ہوئے اور قاضی عنایت اللہ نے اس ملاقات کا اہتمام کیا۔ وزیر اعظم ایک گھنٹے تک اختر حمید خان صاحب کی باتیں سنتے رہے۔ لیکن مجھے ان کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ نہیں سن رہے ہیں کیونکہ اختر حمید خان صاحب ترقی کی باتیں کرتے رہے، اور اس چیز کا خیال ہی نہیں رکھا کہ وزیر اعظم کے پاس اپنے توہین مذہب کے مقامات کے بارے میں بات کرنے کے لیے گئے ہیں ملاقات کے بعد اختر حمید خان صاحب کو اس بات کا احساس ہوا کہ وزیر اعظم ان کی باتوں کو نہیں سمجھ پائے ہیں۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے اپنے توہین مذہب کے مقدمات کے بارے میں بات کیوں نہیں کی تو انہوں نے جواب دیا کہ کیا آپ کو یہ بات معلوم ہے کہ مشرقی پاکستان کے گورنر مومن خان جب صدر ایوب خان سے میری شکایات کرتا تھا تو صدر ایوب اس کی تمام شکایات کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کرتے کہ اختر حمید خان پاکستان میں واحد شخص ہے جو میرے پاس ذاتی کام/سفارشات کے لیے نہیں آتے۔ بہر حال وزیر اعظم نے اختر حمید خان کے خلاف دائر مقدمات کو واپس لینے کا حکم جاری کیا۔ گورنر سندھ کی درخواست کو کراچی میں پریزائڈنگ جج نے قبول کیا اور مقدمے کو واپس لینے کی اجازت دی۔ تاہم گورنر پنجاب کی درخواست کے باوجود ملتان میں دائر کردہ مقدمے کو واپس لے جانے کے لیے کورٹ کی طرف سے اجازت نہیں ملی، اور یہ مقدمہ ان کی وفات تک التوا میں رہا۔

اورنگی پائلٹ پروجیکٹ نے انہیں بہت زیادہ سکون اور اطمینان دیا۔ میں انہیں ملنے اکثر کراچی جاتا رہتا تھا۔ وہ مجھے OPP کے دفتر کی نئی عمارت دکھانے لے جاتے تھے، جسے عارف حسن نے ڈیزائن کیا تھا اور شیکسپیر کا مذاق سناتے، جس نے اپنی نسبت کم خوبصورت محبوبہ کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا، وہ کوئی خاص تو نہیں ہے لیکن وہ میری ہے۔ OPP عابدی صاحب کی نگاہوں میں تو

کوئی زیادہ عظیم الشان پروجیکٹ نہیں تھا لیکن اختر حمید خان صاحب اس سے بہت خوش تھے۔ وہ مجھے عظیم الشان اور بہت تیزی سے وسیع دینے کے خلاف مشورے دیا کرتے، ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی لچک اور کھلا ذہن تھا۔ وہ ایک organic, pragmatic, sociological approach کی تبلیغ کرتے رہتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ کس طرح سے انہوں نے AKRSP میں کومیلا اور داودزئی کے تجربات کو اپنایا اور کس تیزی کے ساتھ اس فرق کو دور کر لیا جو OPP کے لیے کراچی میں حاصل تھا وہ شرائط جو شمالی علاقہ جات میں AKRSP کو حاصل تھے۔

ایک مرتبہ انہوں نے پرجوش انداز میں سپورٹ آرگنائزیشن بنانے کے خلاف دلائل دئیے اور موجودہ NGOs کو معاون اداروں کے طور پر استعمال میں لانے کی وکالت کی۔ انہیں لگا کہ میں غیر ضروری طور پر پورے ملک میں AKRSP طرز کے ادارتی ڈھانچے کو رورل سپورٹ پروگرامز کی شکل میں پھیلا رہا ہوں۔ تاہم 60 سے زیادہ موجودہ NGOs کے ساتھ اشتراک عمل کرنے کے بعد جب انہیں پتہ چلا کہ صرف 2 یا 3 ایماندار تھے باقی تمام NGOs نے OPP کے ساتھ دھوکہ کیا تو انہوں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے سب کے سامنے تسلیم کیا کہ وہ غلط تھے اور اعلان کیا کہ RSPS خوش قسمت ہیں کہ یہ عام NGOs جیسے نہیں ہیں۔ ان کی organic, pragmatic, sociological approach اکثر لوگوں کو کنفیوز کرتی تھا۔ وہ کہتے کہ اختر حمید خان صاحب اب بدل گئے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ ان کے پاس وہ ویژن اور دوراندیشی ہے جس کے تحت حکمتِ عملی کو تبدیل شدہ حالات کے مطابق اپنایا جاتا ہے۔ اورنگی کی گلیوں میں لوگوں کو شمالی علاقہ جات کی دیہی آرگنائزیشن کے طرز پر منظم کرنا نہ صرف مشکل ہوتا بلکہ بے فائدہ بھی ہوتا اور جب تنظیمیں ہی موجود نہیں تھیں تو OPP کے کریڈٹ پروگرام کو بچت پر قائم کرنا بیکار ہوتا۔ اس لئے انہوں نے حقیقت پر مبنی سوچ، سماجی خدوخال کو مدنظر رکھتے ہوئے نئے سانچے اور ڈیزائن تشکیل دئیے جو تبدیل ہوتی ہوئی صورتحال کے مناسب ہوتے۔ وہ خود انحصاری پر

پختہ یقین رکھنے والے تھے۔ NRSP میں ایک تقریر کے دوران انہوں نے اسے یوں بیان کیا

As I look back, I realize that there is one main feature in Pakistan which is very disturbing; the failure of governance. Things,which were done competently in the colonial past, are neglected. Let me give you an example; In the Punjab. the world's largest irrigation network was built by indian experts, the chief engineer might have been an Englishman but he had worked in india for 20 to 30 years .He was not a London -based consultant but an Indian officer and all his assistants were Indians. Now take, for instance, the sewerage system in Karachi. Its last expansion took place in Ayub Khan's time. Since then it has been grossly neglected and is all silted up and choked .we are sitting on a time bomb. Now what has been done to rectify Karachi's sewerage? The Government of Pakistan and the Karachi Water and Sewerage Board (KWSB) has rushed to the World Bank and the Asian Development Bank and asked for loans. The first condition of loans is that the banks would bring foreign

consultants. So, foreign consultants came and they recommended the most modern system which was not only 10 times more expensive than the old system we had, but also it was inoper in Karachi. It was too deep and sophisticated. It needed robots to clean it.In the old system, the nalas could be cleared by scavengers,as they only had to go down 6 feet instead of 30 feet We have been researching this problem in Karachi for the last 8-9 years and we are lucky that we have won our fight with the Asian Bank and the World Bank who are willing to accept our alternative model (the local design) which is much cheaper, functional and already connected to thousands of sewers. But our problem is the sewerage Board's Foreign Aid section which is as willing to give up the foreign loan as a heroin addict is willing to give up heroin. They are not willing to forego the thrills and the highs that they get from dollar loans.

انہیں انٹرنیشنل مانیٹرنگ فنڈ (IMF)، ورلڈ بنک یا ایشین ڈیولپمنٹ بنک (ADB) سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ لیکن ان کے نزدیک وہ اچھے بنکار نہیں تھے۔ وہ اچھے بنکار کے برخلاف لوگوں کو

قرض دیئے جاتے ہیں اور اپنے گاہکوں پر قرض کا بوجھ بڑھاتے رہتے ہیں۔ملک پر چھائی اداسی کے باوجود اختر حمید خان ہمیشہ روشن پہلو پر نظر رکھتے تھے۔وہ اپنے قائم کیے ہوئے غیر روایتی شعبے کی لچکداری اور کامیابی کی باتیں کرتے رہتے۔وہ چیلنج کرتے تھے کہ اورنگی میں کوئی بھکاری نہیں ہوسکتا۔انہیں اس بات پر اعتماد تھا کہ لوگ اپنی حالت بہتر بنانے کی سوچ رکھتے ہیں۔ان کے مطابق انہیں صرف ایک معاون ادارے اور level playing field کی ضرورت ہوتی ہے وہ کہا کرتے تھے کہ

"In Pakistan development will not come from the top.It will from the bottom and it shall happen in pockets-one island formed here and one island there and one island will be made by you"

ان کے آخری دورہ اسلام آباد کے موقعہ پر میں نے جہانگیر ترین کی طرف سے لودھراں کے دورہ کی دعوت کا ذکر کیا تاکہ چھوٹے قصبہ جات کے لیے سیوریج اور سینی ٹیشن کا ماڈل بنایا جائے،تو وہ لودھراں جانے کیلئے فوراََ تیار ہو گئے حالانکہ وہ اس سے پہلے وزیراعلی پنجاب کے دورہ OPP کے کوئی نتائج نہ نکالنے پر مایوس تھے۔انہوں نے لودھراں کے ماڈل کو ترقی دینے کے منصوبے میں بہت دلچسپی لی۔درحقیقت امریکہ سے میرے لیے ان کی آخری اپیل لودھراں کے بارے میں ہی تھی۔

اختر حمید خان پاکستان میں حکومت کی تبدیلی سے تین دن پہلے امریکہ میں وفات پا گئے، جہاں وہ اپنی پیاری بیٹی سے ملنے گئے ہوئے تھے۔طارق عزیز نے پہلے سے تیار جنرل پرویز مشرف کو اختر حمید خان صاحب کے لیے بعد از وفات نشان امتیاز دلانے کیلئے آمادہ کیا۔

"In all my travels throughout the world. I have never

come across a person of the stature of Akhter Hameed Khan. I sometimes wonder did Pakistan really make the best use of the unique experience with which he was so willing and keen to benefit his countrymen and women.But now it is too late even to ask this question.The country has missed an opportunity of a century"

انعم مفتی: بہت شکریہ سر! ان تمام یاد داشت کو پیش کرنے کے لئے ہم آپ کے شکر گزار ہیں ل۔ اب ہم منصور رضا سے درخواست کریں گے کہ وہ آج کے اس پہلے سیشن کو ماڈریٹ کریں۔ اس سے پہلے میں ان کا مختصر تعارف بھی کرانا چاہوں گی۔ منصور رضا تحقیقی میدان میں پچھلے 28 سال سے شامل ہیں۔ کئی اہم ترقیاتی پروجیکٹ میں شامل رہے ہیں۔ این جی اوز فیلڈ میں بھی ان کا کام نمایاں ہی رہا ہے۔ منصور رضا زیبسٹ یونیورسٹی اور این ای ڈی یونیورسٹی میں وزیٹنگ فیکلٹی میں شامل ہیں۔

منصور رضا: انعم بہت شکریہ آپ کا۔ شعیب سلطان صاحب نے اپنی تقریر کے حوالہ سے ہمیں پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ وہ انگریزی میں ہے اسی لیے ہم نے آپ ساتھیوں کی سہولت کے لیے اردو میں ترجمہ کروادیا ہے جو ساتھی لینا چاہیں وہ والینٹیر سے حاصل کر سکتے ہیں۔ شعیب صاحب آپ کا بہت شکریہ کہ آپ کی تقریر سے پہلے ڈاکٹر اختر حمید خان کی زندگی کے کچھ پہلو مجھ پر بھی آشکار نہیں تھے وہ آپ کی تقریر سے مجھ پر واضح ہوئے۔ میں آج کے پینلسٹ کا تعارف کروانا چاہوں گا۔ ہمارے ساتھ پہلے پینلسٹ محترم اور سینیئر سیاست دان، ہمہ جہتی شخصیت کے مالک جناب تاج حیدر موجود ہیں۔ تاج صاحب کی شخصیت کا سیاسی پہلو بہت نمایاں ہے وہ 2010 سے پیپلز پارٹی

کے جنرل سکریٹری رہے ہیں ۔ڈرامانگار اور اسٹوڈنٹ ایکٹیوسٹ بھی ہیں ۔ان کا جتنا تعارف کرایا جائے وہ کم ہے ۔تاج صاحب آپ کی تشریف آوری کا بہت شکریہ ۔ہمارے دوسرے پینلسٹ کرامت علی صاحب ہیں ۔ان سے ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے ۔ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف لیبر ایجوکیشن (پائلر) کے ڈائرکٹر ہیں ۔ان کی ساری عمر جد و جہد میں ہی گزری ہے ۔مزدور رہنما ہیں ۔ طالب علموں کے ساتھ ،ٹریڈ یونین کے ساتھ ،مزدوروں کے ساتھ ان کا تعلق بہت گہرا رہا ہے ۔ ہماری تیسری پینلسٹ رابعہ صدیقی صاحبہ ہیں جنہوں نے اپنے کیریئر کی شروعات اورنگی پائلٹ پروجیکٹ سے کی ۔داؤد کالج

پینلسٹ کے شرکاءڈاکٹر صاحب کے افکار پر گفتگو کرتے ہوئے

کے شعبہ آرکیٹیکچر اینڈ پلاننگ میں تدریسی ذمہ داریاں ادا کر رہی ہیں ۔انور راشد صاحب بھی آج کے اس سیشن کے پینلسٹ ہیں لیکن اچانک ان کی طبیعت ناساز ہوئی جسکی وجہ سے وہ کانفرنس میں براہ راست شامل نہیں ہو سکے ہیں ۔البتہ انہوں نے اپنا پیغام وڈیو کی صورت میں بھیجا ہے جسے ہم سنیں گے ۔ بہت شکریہ آپ تمام پینلسٹ کا ۔

اب میں تاج حیدر سے درخواست کروں گا کہ آج شعیب سلطان صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں جو تقریر فرمائی ہے اس پر اپنے تاثرات کا اظہار کریں ۔

تاج حیدر: شعیب سلطان صاحب نے اختر حمید چاچا کی زندگی کے بارے میں جو کچھ بھی بیان کیا ہے ۔ان کی جتنی بھی جہتیں بیان کی ہیں اس میں میرے سیکھنے کے لیے بہت کچھ ہے ۔آپ نے مجھ ناچیز کے تعارف کے لیے بہت بڑے بڑے الفاظ استعمال کیے ہیں جو مجھے شرمندہ کرنے کے لیے کافی ہیں ۔لیکن میں یہ بھی بتانا چاہوں گا کہ میں نے اپنی زندگی میں دو لوگوں سے

بہت کچھ سیکھا ہے ۔ ایک میرے والد پروفیسر کرار حسین اور دوسرے میرے چاچا اختر حمید خان ۔اکثر میں انہی کی کہی ہوئی باتیں دہراتا ہوں تو میری بات رہ جاتی ہے ۔شعیب سلطان صاحب نے بڑی تفصیل سے ہمیں بتایا کہ دو ماڈل ہیں ۔ایک ماڈل خود انحصاری کا ہے ۔اس ماڈل کے اندر اپنی صلاحیتیں ،اپنے وسائل اور اپنی آرگنائزیشن یہی باتیں اس ماڈل کی بنیاد ہیں ۔ یہ آگے بڑھنے کا ایک مناسب طریقہ ہے جو پائیدار، مستحکم بھی ہے ۔دوسرا ماڈل انحصاری کا معاملہ ہے کہ ہم سب کی یہی سوچ رہی ہے کہ کوئی باہر سے آ کر مدد کرے گا ہماری تربیت کرے گا ۔ہمیں فہم و دانش بھی دیگا ۔وسائل بھی دے گا اور پھر ہم ترقی کرلیں گے ۔ یہ چیز سمجھنے کی ضرورت ہے کیونکہ شعیب سلطان صاحب نے بھی ہمیں بتایا کہ وہ اس بات سے ہرگز خوش نہ تھے کہ ورلڈ بنک سے مالی مدد لی جائے ۔ یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ ورلڈ بنک نے درمیان میں ایک نیا رخ اختیار کیا تھا وہ ایک (غریب نواز) pro poor رخ تھا کیونکہ اس کے نئے پریزیڈنٹ آئے تھے جو اس بات کو سمجھتے تھے کہ ہمیں غریب طبقات کے لیے کچھ کرنا چاہیئے اور وہ میٹنگ کے لیے اورنگی پائلٹ پروجیکٹ گئے تھے جس میں عارف حسن بھائی بھی موجود تھے ۔سرتاج عزیز اس زمانہ میں وزیرخزانہ تھے ۔کوئی دو گھنٹہ کی گفتگو کے بعد انہیں نے چاچا (ڈاکٹر اختر حمید خان) سے کہا کہ ہم آپ کو blank cheque دینا چاہتے ہیں ۔آپ صرف اپنی ضرورت ہمیں بتائیں ۔سرتاج عزیز نے چپکے سے ان کے کان میں کہا کہ سو ملین ڈالر کہہ دیجئے ۔ اس پر چاچا (ڈاکٹر اختر حمید خان) نے جواب دیا کہ" شاید میں اپنا فلسفہ ٹھیک سے بیان نہیں کرسکا کہ ہم کیا کررہے ہیں اور کس طرح سے کام کرنا چاہتے ہیں" ۔ اور یوں انہوں نے وہ رقم جو 100 ملین ڈالر بنتی یا اس سے کم زیادہ بنتی ۔ یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ "ہمیں اپنے وسائل اور صلاحیتوں کے مطابق ہی کام کرنا ہے نا کہ ہم کسی بیرونی مدد کا انتظار کریں" ۔

بابا (پروفیسر کرار حسین) جب آخری دنوں میں بیمار رہنے لگے تھے تو ایک دن مجھے کہنے لگے کہ

” دیکھو ہم انگریزوں کے غلام تھے اور آقا کو ہمیشہ غلاموں کی ضرورت رہی ہے“ ۔اب صورتحال بدل گئی ہے اب ان سے ہمارا رشتہ مولا اور موالی کا ہوگیا ہے ۔کہ جب تک وہ امداد نہ کرے ہم اپنے ملک کو چلا ہی نہیں سکتے اور سب سے اچھا افسر یا حکومت وہ ہے جو پیسے باہر سے لیکر آئے ۔واقعی اب انہی باتوں پر فخر ہونے لگا ہے کہ ہم باہر سے اتنے پیسے لے آئے ہیں۔میں اس بات کا بھی ذکر کروں کہ ایک بار مجھے پروفیسر گلف لین سے شرفِ ملاقات ہوا۔انہوں نے کہا کہ جو بھی بین الاقوامی مالیاتی انسٹی ٹیوٹ ہیں ہمیں ان سے اپنا سلسلہ ختم کرنا چاہیے میں نے انہیں بڑی حیرانی دیکھا اس وقت گورنر کمال اصغر بھی میرے ساتھ موجود تھے انہوں نے کہا when you dont have the money you find your solutions and you always find them. ۔ بات یہی ہے کہ آپ حل پر مبنی نقطۂ نظر رکھتے ہیں یا پھر آپ باہر کی طرف دیکھتے ہیں۔

چاچا (ڈاکٹر اختر حمید خان) نے ہمیں یہی سکھایا ہے کہ آپ اپنے وسائل سے اپنی زبچت سے اپنی صلاحیتیں کام میں لاتے ہوئے پنی آرگنائزیشن کے ذریعہ یہ سفر بڑی کامیابی کے ساتھ طے کر سکتے ہیں۔میں اپنی گفتگو کا اختتام اس بات پر کروں گا کہ انہوں نے مجھے تاکید کی تھی کہ تم اپنے بابا کی طرح نہ ہونا۔

بندر روڈ پر ہم ایک جلوس (procession) نکال رہے تھے ۔ بابا (پروفیسر کرار حسین) اور اردشیر کاؤس جی دونوں ایک سزوکی میں بیٹھے تھے ۔ چاچا (ڈاکٹر اختر حمید خان) میری کمر میں ہاتھ ڈال کر پیدل چل رہے تھے انہوں نے کہا کہ تاج اپنے بابا کی طرح نہ ہونا بے شک ہم ان کے دوست ہیں اور ہمیشہ سے دوست ہیں۔میں نے کہا کہ میرے بابا کا ایسا کیا قصور ہے ۔کہنے لگے کہ ایک اچھا دماغ ساری انسانیت کے لیے ہوتا ہے ۔پہلے انہوں نے ہندوستان چنا، پھر ہندوستان کے مسلمانوں کو چنا مجھے بھی خاکسار تحریک میں لے گئے۔مسلمانوں میں انہوں نے

اثنائے عشری کے لوگوں کو چنا جو اقلیت میں تھے اور پھر ان اثنائے عشری میں بھی ان لوگوں کو چنا جو بہت کم ہوتے ہیں۔تو وہ اکثریت سے اقلیت کی طرف جاتے گئے۔اسی لیے تم اپنے دائرہ کو محدود نہ کرنا بلکہ اسے بڑھاتے جانا۔میں نے جواب دیا چاچا(ڈاکٹر اختر حمید خان)بات تو سمجھ آتی ہے ۔ایک چیز اور جو میں بابا اور چاچا کے تعلق کے درمیان میں آئے بغیر کہوں گا کہ دلی (ہندوستان) میں یہ لوگ(بابا اور چاچا) کہیں جارہے تھے ان کی عمر اس وقت بائیس تیئیس سال رہی ہوگی۔اس وقت کیرو نامی ایک پامسٹ تھا جس کی اپنی شہرت رہی ہے ۔وہ بھی وہیں نزدیک تھا۔ان دونوں کو غالباً تفریح سوجھی اور یہ سیڑھیاں چڑھ کر اس کے دفتر پہنچے ۔اس نے کہا کہ میں ہاتھ دیکھنے کے 30 روپے لیتا ہوں ۔چاچا(ڈاکٹر اختر حمید خان) نے کہا کہ تم اتنے بڑے پامسٹ ہو۔قسمت کا حال جانتے ہو تمھیں یہی نہیں پتا کہ ہم دونوں کے پاس ملا کر صرف 2 روپے ہیں۔جب یہ لوگ واپس جانے لگے تو کیرو نے کہا کہ رکو !اچھا میں فیس نہیں لوں گا لیکن صرف ایک ہی بات بتاؤں گا جو تم دونوں کے لیے ہے۔تم دونوں زندگی بھر دوستو اور بھائیوں کی طرح رہو گے اور دنیا سے ساتھ ہی جاؤ گے۔

اکتوبر 1999 میں چاچا کا انتقال امریکہ میں ہوا۔ہم میں یہ ہمت نہ تھی کہ امی اور بابا کو یہ خبر دے سکیں کہ چاچا اب دنیا میں نہیں رہے ۔ان دنوں بابا کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں چل رہی تھی۔ جب چچی گھر آئیں تو ہماری امی ان سے ناراض تھیں انھوں نے خفا ہو کر کہا کہ یہ تم نے کیا کیا،تم نے بھائیوں کو جدا کر دیا۔انہیں یہ اطلاع تو کر دو کہ ان کے بھائی کی طبیعت خراب ہے ۔وہ فوراً امریکہ سے آجائیں گے ۔اور ہم سب خاموش سن رہے تھے ۔پھر 7 نومبر کو جیسا کہ کیرو نے کہا تھا مہینہ بھر کے اندر بابا بھی ہم کو چھوڑ کر چلے گئے ۔تو یہ تعلق اور دوستیاں بھی آسان نہیں۔

بابا ایک بات کہا کرتے تھے کہ ہم آہنگی اور دوستیاں بھی اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب نیک کاموں میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا جائے ۔ساری زندگی چاچا نے اسی طرح گزاری اور آج

نوجوانوں کے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اختر حمید خان کس فلسفہ پر کام کر رہے تھے اور خود انحصاری کا راستہ بڑی آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ڈاکٹر شعیب نے بڑی گہری اور تفصیلی بات کی ہے۔ان دو راستوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔اب جبکہ ہمارا ملک ایک دوراہے پر کھڑا ہے جبکہ وہ راستہ جو انحصار کرنے کا ہے وہ بلاک ہو چکا ہے۔اگر ہمیں اس ملک کو باقی رکھنا ہے تو طوعاً اور کرہاً اسی خود انحصاری کے راستہ پر آنا پڑے گا۔بہت شکریہ آپ ساتھیوں کا

منصور رضا: بہت شکریہ تاج صاحب !آج میں نے بھی اس نصیحت کو ذہن نشین کرلیا ہے کہ دوستی نیک کاموں کی ہوتی ہے اور نیک کاموں کی ہی وجہ سے ہوتی ہے۔کرامت صاحب میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ ڈاکٹر اختر حمید کی شخصیت پر کچھ اظہارِ خیال کریں۔

کرامت علی: جی بہت شکریہ! ابھی جو گفتگو رہی ہے اس میں مجھے بھی ڈاکٹر اختر حمید خان کے بارے میں نئی چیزیں پتا چلی ہیں۔مجھے بھی یہ اعزاز حاصل رہا ہے کہ 1960 میں ان تین لوگوں سے میرا ملنا رہا۔ 1963 کی طالب علم تحریک میں جب دربدر کر دیا گیا تھا۔وہاں میری ملاقات تاج حیدر کے بڑے بھائی جوہر حسین صاحب سے ہوئی جو اس تحریک کی مقامی قیادت کر رہے تھے ان کے ذریعہ تاج حیدر صاحب، پرفیسر کرار حسین اور پھر ڈاکٹر غلام کبریا سے ملاقات ہوئی۔اس کے بعد پھر اختر حمید خان صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ پتا چلا کہ ان تینوں کی زندگی ان کے کام کے حوالے سے اور علی گڑھ سے جڑی ہوئی ہے ۔مجھے تو ایسا لگتا تھا کہ خدا نے ان تینوں میں صفات کچھ اس طرح بانٹ دی ہیں کہ جب یہ تینوں ایک جگہ ہوتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے ان تینوں افراد میں انسانیت کو یکجا کر دیا ہے اور انسانیت ان تینوں کو جوڑنے سے ہی پتا چلتی تھی۔ پروفیسر کرار صاحب،کبریا صاحب اور اختر حمید خان صاحب کا مزدوروں کے ساتھ ایک خاص لگاؤ تھا اور انہوں نے ہمیشہ مزدوروں کے رہائشی علاقوں یا کام کی جگہ کو ترجیح دی۔ ان کی جدوجہد یہی تھی کہ محنت کشوں کے حالات میں تبدیلی لائی جائے۔کبریا صاحب نے

appropriate technology شروع کی تھی۔اور شہر کے پس ماندہ علاقوں میں کام کا آغاز کیا۔کبریا صاحب ہمارے ادارے پائیلر کے بانی ممبر تھے۔کرار حسین صاحب بہت بڑے pattern تھے۔ڈاکٹر اختر حمید خان نے اورنگی پائلٹ پروجیکٹ شروع کیا تو مجھے ان کے ساتھ ملنے کا موقع ملا۔بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔اورنگی پائلٹ پروجیکٹ میں جب کام کا آغاز ہوا تو آہستہ آہستہ لوگوں کو بھی معلوم ہونا شروع ہوا۔یہ 1990 کا زمانہ تھا۔میں اس وقت ٹریڈ یونین میں تھا۔وہاں ایک طرف اورنگی اور دوسری طرف تین پختون آبادیاں تھیں۔جہاں کے رہائشی زیادہ تر ٹیکسٹائل کے ملازمین تھے۔اسی لیے میرا وہاں جانا رہتا تھا۔اختر حمید صاحب کی بڑی خواہش تھی کہ ان علاقو ں میں بھی کام کیا جائے۔ہم نے 6 ہفتہ تک کوشش کی۔یہ تینوں کالونی پیر آباد، فرنٹیئر کالونی اور پٹھان کالونی پہاڑیوں پر آباد تھیں اور ابھی بھی ہیں۔ظاہر ہے وہاں سیوریج کی سہولتیں اورنگی کے میدانی علاقے کی طرح تو نہیں ہو سکتی تھیں لیکن اختر حمید صاحب ان لوگوں کے لیے کوشش کرتے رہے اور پھر جب 80 کی دہائی کے درمیان لسانی فساد بڑھ گئے ایک دوسرے کی کالونی میں آنا جانا بند ہوا۔لسانی تعصب عروج پر تھے۔انہیں اس بات کا بہت دکھ رہا کہ ہم اس تعصب کی وجہ سے ان علاقوں میں کام نہیں کر پا رہے ہیں۔ان دنوں مہاجر قومی موومنٹ بھی بن گئی تھی اور جو رجحانات سامنے آرہے تھے اسی بناء پر ہم نے کہا کہ اب ان سیاسی پہلوؤں کو بھی اٹھانا چاہیئے۔اس پر وہ سختی سے منع کر دیتے اور کہتے کہ ہمارا کام لوگوں کو ملا کر کام کرنے کا ہے اس میں سیاست کو شامل نہیں کرنا چاہیے۔کافی عرصہ وہ اسی بات پر کار بند رہے۔مگر جب 90 کی دہائی کے بیچ میں یہ بہت بڑھ گیا۔ان دنوں ہمارا مزدوروں کا تربیتی پروگرام چل رہا تھا۔آخری دن ہم نے ڈاکٹر صاحب کو بھی زحمت دی۔وہ اکثر آجایا کرتے تھے۔انہوں نے حسبِ معمول اپنے دھیمے لہجہ میں گفتگو شروع کی لیکن پھر ایک دم سے انہیں جوش آگیا اور انہوں نے کہا کہ حالات کو دیکھتے ہوئے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اب انقلاب کے بغیر کچھ نہیں ہوگا۔ہم بھی ایک دم حیران رہ گئے کہ یہ کایا کیسے پلٹ گئی

اور واقعی وہی دن تھا جب انہوں نے اُن محنت کشوں سے ان کی عالمی تحریک کے حوالہ سے بہت تفصیل سے بات کی۔انہیں مستقل یہی کہتے رہے کہ اپنی صفوں میں آرگنائز ہو جائیں۔ چاہے سیاست میں شامل ہوں یا جیسے بھی ہوں اس ملک میں انقلاب لائیں اور ہمیں اس کے لیے کام کرنا چاہیئے۔

پھر آخری دنوں میں لوگوں نے ان کے خلاف کچھ فضولیات کہنی شروع کیں حتیٰ کہ توہین رسالت کاالزام بھی لگایا گیا۔اس بات سے ہمیں بھی مایوسی ہوئی کہ ساری زندگی انسانیت کی خدمت کرتے رہو اور آخر میں لوگ آپ پر اس طرح کے الزام لگائیں۔مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ہائی کورٹ میں ان کی پیشی تھی۔ ہم بھی وہیں ان کے ساتھ موجود تھے۔اس وقت ڈاکٹر صاحب بہت مایوسی کی کیفیت میں تھے۔میں نے جو ان تین لوگوں سے سیکھا ہے وہ یہی ہے کہ معاشرہ میں حالات بے شک آپ کے خلاف چل رہے ہوں لیکن مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ کچھ کامیابیاں فوری نتائج نہیں دکھاتیں۔بس آپ کا اپنی ذات کے ساتھ جو بھی عہد ہے اسے نبھانا ہوتا ہے۔نہ مایوس ہونا چاہیئے اور نہ ہی خوفزدہ ہونے کی ضرورت ہے۔باوجود اس کے کہ وہ ISS آفیسر تھے لیکن ان کا لوگوں کے ساتھ بہت زیادہ ملنا جلنا تھا۔ان کے طور طریقے ،بات چیت سب عام لوگوں کی سمجھ میں آنے والی ہوتی تھیں۔وہ عام لوگوں کی زبان میں ہی بات کیا کرتے تھے۔کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنے بڑے آفیسر رہے ہونگے۔ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔یہ تینوں افراد اپنی ذات میں ایک مثال تھے۔ہم جب طالب علم تھے اور طلباء یونین کا حصہ بنے تو ہم بار بار انہی کی طرف دیکھا کرتے تھے کہ ہمیں یہیں سے سیکھنے کو ملتا تھا۔پروفیسر کرار ہوں یا کبریا صاحب یا پھر اختر حمید صاحب۔ہمیشہ ہماری رہنمائی کرتے تھے۔ہم مزدوروں کے لیے کوئی پروگرام کرتے اور انہیں ایک دن پہلے بتاتے تو بھی وہ سب سے پہلے پہنچ جاتے تھے۔ہم ان سے جتنے وقت کی فرمائش کرتے وہ اتنا بھر پور وقت دیتے تھے۔مزدوروں کے ساتھ ان کی ٹوٹل کمٹمنٹ تھی۔اکثر ہمارا گارڈن والے گھر میں جانا ہوتا تھا ہمیں بہت وقت دیتے تھے۔میں تو ابھی بھی یہی محسوس کرتا ہوں کہ انہوں نے

اپنے بچوں کی طرح شفقت دی ہے ۔تاج حیدر ہوں یا جوہر حسین ہوں ۔انہوں نے کوئی تفریق نہ کی ۔کرار صاحب بلوچستان میں ٹیچر تھے ۔آج بھی وہاں کے لوگ انہیں یاد کرتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ ایسا جوڑ دیا تھا۔ یہ تینوں ہی ہجرت کر کے آئے تھے لیکن اس کے باوجود لوگوں کو اپنے خاندان کے جیسا سمجھتے تھے ۔انہوں نے پاکستان کے جس علاقے میں بھی کام کیا ایسا لگتا تھا جیسے وہ انہی کا علاقہ ہو۔ وہ کسی کے ساتھ کوئی فرق نہ رکھتے تھے ۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے ۔آمین

اب اس زمانہ میں ان جیسے لوگ نہیں ۔ہمیں ان کی باتوں کو عام کرنے کی ضرورت ہے ۔بلکہ میں اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ بات کروں گا کہ ان تینوں عظیم لوگوں پر کوئی اشاعت ہونی چاہیئے ۔ان تینوں شخصیات کے بارے میں علیحدہ علیحدہ یا پھر ایک ساتھ کچھ لکھے جانے کی ضرورت ہے کیونکہ ان کے تجربات کو میلا ،علی گڑھ تک پھیلے ہوئے تھے ۔میں بھی اس میں ذمہ داری لینے کے لیے حاضر ہوں ۔بہت شکریہ آپ کا

منصور رضا: بہت شکریہ کرامت صاحب ! ہم نے آپ کی تجویز نوٹ کرلی ہے اس کام کو آگے بڑھائیں گے ۔آپ کی گفتگو بہت عمدہ رہی کہ ہمیں مایوس اورخوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے ۔ اب میں رابعہ صدیقی صاحبہ سے درخواست کروں گا کہ وہ ڈاکٹر صاحب سے متعلق کچھ بات کریں۔

رابعہ صدیقی: مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں نے ڈاکٹر اختر حمید صاحب کے ادارے اورنگی پائلٹ پروجیکٹ سے اپنا کیریئر شروع کیا جہاں 13 سال کام کیا اور آج تک اس کے ساتھ وابستگی ہے ۔ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میرا وقت زیادہ تو نہیں گزرا لیکن ان کے شاگرد میڈم پروین اور سلیم علیم الدین کے ساتھ کام جاری رکھا تھا۔ڈاکٹر اختر حمید نے 8 سال اورنگی پر تحقیق کی تھی اور انہوں نے اس تحقیق کا نچوڑ ایک فلسفہ کی صورت میں پیش کیا تھا اور وہ فلسفہ وہی ہے جو شعیب سلطان صاحب نے اپنی گفتگو میں بارہا بیان کیا یعنی اپنی مدد آپ ۔اختر حمید صاحب اکثر یہ جملہ کہا

کرتے تھے کہ کمیونٹی کو مچھلی پکڑ کر نہ دو بلکہ اسے مچھلی پکڑنے کا طریقہ بتاؤ۔ تاکہ کمیونٹی ایک عرصہ تک کام کر سکے ۔میں دو پروگراموں کم لاگتی سینی ٹیشن اور کم لاگتی رہائشی یونٹ میں تھی ۔ low cost sanitation میں conclude honor ship کا تصور تھا۔ کمیونٹی کو بتایا جاتا تھا کہ آنرشپ کیا ہے تاکہ وہ اس کام کو اپناتے ہوئے اسے جاری رکھیں ۔دوسرا ان کا پروگرام low cost housing کا تھا اس میں ٹیکنالوجی کو استعمال کیا۔ نئے آنے والے نوجوانوں کو کام سکھایا۔ پیرا آرکیٹیکٹ تیار کیے تاکہ وہ خود انحصاری روزگار کی طرف مائل ہوں ۔دوسری چیز جو میں نے سیکھی کہ ڈاکٹر صاحب ٹیم ورک پر بہت زور دیتے تھے ۔ وہ ہمیشہ کمیونٹی ، پیشہ ور کارکن اور مقامی حکومتی ادارے مل کر کام کریں ۔عارف صاحب آج کل داؤد یونیورسٹی میں بھی ہوتے ہیں ۔ہم ان سے بھی وہاں بہت کچھ سیکھتے ہیں کہ کام میں پائیداری کس طرح ہو۔ ان حضرات سے جو کچھ سیکھا ہے ہم اسے عملی طور پر اپنانے کی کوشش کرتے ہیں اور انہی اصولوں کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کرتے ہیں ۔بہت شکریہ آپ حضرات کا۔

منصور رضا: بہت شکریہ رابعہ ۔ہمارے وہ ساتھی جو آج اس پروگرام میں شامل نہیں ہو سکے انہوں نے اپنے وڈیو پیغام بھیجے ہیں ۔ہم ایک ترتیب سے انور راشد، ڈاکٹر منصور علی اور فیاض باقر صاحب کے پیغامات سنیں گے ۔ان تینوں حضرات کا تعلق او پی پی اور ڈاکٹر اختر حمید کے ساتھ رہا ہے ۔انور راشد صاحب او پی پی او سی ٹی کے ڈائریکٹر ہیں۔ ایک طویل عرصہ تک ان کی رفاقت ڈاکٹر صاحب کے ساتھ رہی ہے ۔ڈاکٹر منصور علی بحیثیت کنسلٹنٹ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ رہے انہوں نے بھی او پی پی سے اپنا کیریئر شروع کیا۔ آج کل انگلینڈ میں ہوتے ہیں ۔فیاض باقر صاحب کینڈا میں درس وتدریس میں شامل ہیں ساتھ ہی وہ ڈاکٹر اختر حمید ریسورس سینٹر کے بانی ممبر ہیں ۔

انور راشد (وڈیو پیغام): افسوس کی بات یہ ہے ۔مجبوراً یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ ڈاکٹر اختر حمید صاحب کی کانفرنس ہے اور میں وڈیو کی صورت یہ پیغام دے رہا ہوں جبکہ مجھے یہاں ہونا چاہیے ۔میں اس

کے سوا کیا کہوں کہ

ع احساسِ محبت کو کچل دیتے ہیں آلات

ڈاکٹر اختر حمید کے بارے میں لوگوں نے بہت کچھ کہا اور بہت کچھ لکھا۔ڈاکٹر یونس (گرامین بنک) لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر اختر حمید کو Re-Discover کرنے کی ضرورت ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈاکٹر اختر حمید کی پوری شخصیت کو سامنے نہیں لایا جاسکا ہے۔اور یہ بات سچ ہے۔ اختر حمید صاحب سے میری پہلی ملاقات جامعہ کراچی میں ہوئی۔وہ میرے استاد تھے۔یہاں سے چہرہ شناسی ہوئی۔یہ 1981 کی بات ہے کہ انہوں نے ایک طالب علم(جوکہ اورنگی ٹاؤن کا رہائشی تھا) کے ذریعہ مجھے ملنے کا پیغام بھیجا۔میں ان کے پاس چلا گیا۔انہوں نے مجھے پروجیکٹ میں شمولیت کی دعوت دی اور میں شامل ہوگیا۔6 مہینہ تک یہی سلسلہ چلا کہ میں صبح یونیورسٹی میں ہوتا تھا اور شام میں او پی پی کی میٹنگ میں شرکت کرتا۔سمسٹر کے اختتام کی وجہ سے انتظار کرنا پڑا۔یہ شروع کی ملاقاتیں تھیں اس کے بعد ڈاکٹر صاحب سے مستقل ملاقات رہی۔یہاں ایک بات اور عرض کردوں کہ میں اور پروین رحمان ہم دونوں نے ایک ہی دن شمولیت اختیار کی تھی۔میں اختر حمید خان کا بہت ادنیٰ سا شاگرد ہوں۔یہاں ان کے بڑے بڑے شاگرد موجود ہیں جو میرے بھی استاد ہیں۔عارف صاحب، تسنیم صدیقی صاحب موجود ہیں۔یہ ہم سب کے لیے اعزاز کی بات ہے بلکہ مجھے تو فخر ہے کہ ان لوگوں کی شاگردی اختیار کرنے کا موقع ملا۔ان کے ساتھ جو بھی کام کیا ہے۔ جتنا بھی سیکھا ہے اسے ایک نشست میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔اگر وقت میسر ہوا تو ان تمام باتوں کو کتابی شکل میں لانا ہوگا۔ہم نے انہیں ایک شاعر کے حوالہ سے دیکھا۔ایک فلسفی کے حوالہ سے دیکھا۔ترقیاتی امور کے ماہر کے ئ حوالہ سے دیکھا۔ایک استاد کی شکل میں بھی دیکھا۔وہ یونیورسٹی میں باقاعدہ پروفیسر رہے ہیں۔ 1981 میں اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کی بنیاد رکھی گئی۔دو ڈھائی سال میں نے اور پروین رحمان نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ خوب محنت کی۔وہ بہت طویل

داستان ہے لیکن ابھی ضرورت اس بات کی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے کام کو سامنے لایا جائے ۔ بالخصوص آج کے کالج یونیورسٹی کے طلباء کو ان کے بارے میں بتایا جائے ۔ یہ ایک بہت بڑا رول ماڈل ہے اور ممکن ہے کہ کوئی طالب علم ان کے نقشِ قدم پر چلنا چاہے ۔ میں نے اور پروین رحمان نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ 17 سال کام کیا ہے ۔ 1982 میں ہم نے شمولیت اختیار کی اور 1999 میں ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہوا۔ اس 17 سال کے عرصہ میں ہم نے جو بھی سیکھا اس مختصر وقت میں اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ علم کسی کتاب میں نہیں مل سکتا۔

ڈاکٹر منصور علی (آڈیو پیغام): 1981 سے میں نے میپنگ سیکھنی شروع کی ۔ یہ وقت اورنگی پائلٹ پروجیکٹ میں انٹرن شپ کا تھا ۔ جہاں کمیونٹی سے متعلق ہمیں معلومات دی جاتیں ۔ ان کا سماجی و معاشی پس منظر بتایا جاتا تھا۔

Asalam O Alikum! This is Dr.Mansoor Ali from UK and I was asked to record a message on community mapping. So, in 1980's I learn about community involement and community mapping through my internship experience at Orangi Pilot Project and we provided the technical detail but the comminity participated and provided further detail about the social & economic status in the area the lane was the unit of the project. Later working with a number of people, especially people like Prof.Robert Chambers, and understanding the rural development aspect I learn

more about community mapping as a tool to empower the community, to undrstand what is important for them and to know and to accept that of technical expert can or must take a backseat when its come to participatory planning. With my work through practical action I also learn how commuity mapping can be connected with government pritiories funding from the government and also built trust between the community members.

Community mapping is obviously an important tool for development and specially for participatory and community life development. But community mapping also sometimes needs support from technical expert, whether they are sitting in the backseat but that backseat is important because community need support in larger infrastructure, larger priorties for example planning for sanitation also need planning for large drains and also needs planning for treatment plants. So I think community mapping with technical support and technical expertise can make a lot of sense.This is my message for you and I hope you will be involved

and do community mapping in more detail. Thankyou

فیاض باقر (ویڈیو پیغام): بہت شکریہ کہ آپ لوگوں نے اتنی دور سے بھی مجھے اس پروگرام میں شامل ہونے کا موقع دیا۔ ڈاکٹر صاحب کے حوالہ سے گفتگو ایک شعر کے ذریعہ ہی شروع کرنا چاہوں گا۔ ڈاکٹر صاحب یہ شعر بہت پڑھا کرتے تھے۔

وہ سامنے بیٹھے رہے میں نے دیکھا ہی نہیں

میں نے آنکھیں بند کرلیں ورنہ پردہ کچھ نہ تھا

یہ شعر ہماری اشرافیہ کے بارے میں تھا کہ وہ عوام کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو نہیں سمجھتے تھے بلکہ جان ہی نہیں پاتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی جو اصل چیز تھی وہ یہی تھی کہ انہوں نے اس ملک کے جفاکش مزدوروں کو کبھی بھی بوجھ نہیں سمجھا بلکہ ایک سرمایہ جانا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر ان محنت کشوں کو منظم کیا جائے تو وہ اپنی بھرپور صلاحیتیں دکھا سکتے ہیں اگر انہیں تنظیم کی شکل میں منظم کیا جائے۔ چاہے وہ اورنگی ٹاؤن ہو یا پاکستان کے شمالی علاقے یا پھر کومیلا مشرقی پاکستان ہو۔ انہوں نے سب کو ہی منظم کیا۔ وہ سب کے لیے یہی مئوقف رکھے۔ جب تک لوگوں کی صحیح رہنمائی نہ ہو تب تک نتیجہ معنی خیز نہیں ہوتا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے support of organization کا تصور پیش کیا جس میں لوگوں کی رہنمائی ہونی چاہئے۔ ان کی تیکنیکی معاونت ہونی چاہیے۔ انہیں اکٹھے مل کر کام کرنا چاہیے۔ وہ لوگ جو دوسروں کی صلاحیتوں کو استعمال کرنا نہیں جانتے وہ سمجھتے ہیں کہ ہر کام پیسے سے ہی ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ لوگ جو پیسوں اور قرضوں سے ملک کو چلانا چاہتے تھے ڈاکٹر صاحب ان کے لیے کہتے تھے کہ" ایک نابینا شخص دوسرے نابینا شخص کی رہنمائی کر رہا ہے"۔ اب لوگوں میں دیکھنے کی صلاحیت کیوں نہیں ہے اس کی وجہ وہ یہی بتاتے تھے کہ پاکستان کا مسئلہ اقتصادی نہیں بلکہ اخلاقی مسئلہ ہے۔ اخلاقی مسئلہ بھی یہی ہے کہ لوگ اکثریت کے لیے کام کرنا نہیں چاہتے بلکہ اپنے لیے کام کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اخلاقی مسئلہ بھی حالات کا جبر نہیں ہے،

اقتدار نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہے، سرمایہ کی کمی کی وجہ سے نہیں ہے۔ یہ اخلاقی مسئلہ ہمارا ذاتی فیصلہ ہے۔ جو لوٹ کھسوٹ کو اپنانا چاہتے ہیں۔ یہاں ایک بڑی تعداد میں طلباء بیٹھے ہیں جنہیں میں بتانا چاہتا ہوں کہ لوگ یہ بہانہ کرجاتے ہیں کہ ہم تو سرکاری افسر ہیں ہمارے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں لیکن اختر حمید صاحب، شعیب سلطان صاحب، تسنیم صدیقی یہ بھی تو سرکاری افسر تھے۔ طلباء اس بات کو سمجھ لیں کہ کوئی بھی چیز آپ کو اپنے ارادہ سے باز نہیں رکھ سکتی سوائے اپنے عمل کے۔ جب ہم کمیونٹی میں کام کرتے تھے تو مجھے اس کے لیے موزوں لفظ self selection کا ملا ہے کہ تبدیلی کا کام کیسے ہونا ہے اس کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ انسان خود ہے۔ اگر آپ فیصلہ کرلیں کہ آپ اس میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو میدان بہت وسیع ہے اور سب اس میں شامل ہوسکتے ہیں۔ میں یہیں اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ بہت شکریہ

منصور رضا: بہت شکریہ آپ تینوں حضرات کا۔ اس کے ساتھ ہی میں سیشن اوپن کرتا ہوں تاکہ آپ میں سے جو دوست پینلسٹ سے سوال کرنا چاہیں تو اپنے تعارف کے ساتھ ضرور کیجئے۔

زاہد فاروق (یوآرسی): آپ تمام کی گفتگو سنی۔ ڈاکٹر اختر حمید، غلام کبریا اس وقت کام کر گئے جب رابطہ کے ذرائع اتنے زیادہ نہیں تھے۔ یہ لوگ خود چل کر کمیونٹی میں جاتے تھے۔ کمیونٹی ان کے پاس آتی تھی لیکن آج کے دور میں جبکہ اتنے مواقع دستیاب ہیں۔ ٹرانسپورٹ دستیاب ہے۔ مقامی و بین الاقوامی فنڈ دستیاب ہیں۔ وسائل موجود ہیں۔ لیکن حالت پھر بھی تبدیل نہیں ہورہی۔ آج بھی دیہی علاقوں میں، سندھ میں کچھ بھی اچھا نہیں ہے۔ لوگ جھونپڑیوں میں رہ رہے ہیں۔ آج بھی شہر کے مرکز تین ہٹی میں کوئی 300 جھونپڑیاں جلی ہیں۔ سرکار کے کام کی رفتار نہ رہی۔ دلچسپی نہ رہی یا پھر لوگوں نے رابطہ، امید سب چھوڑ دی ہے۔

شعیب سلطان: اختر حمید صاحب کہتے تھے کہ اگر آپ کو غربت دور کرنی ہے تو غربت تو گھریلو سطح پر ہے۔ اسی لیے جب تک آپ غریب کے گھر نہیں پہنچیں گے تو غربت تو دور نہیں ہوسکتی۔ اسی لیے وہ

کہتے تھے کہ جو حکومتی ادارے ہیں جیسا کہ انتظامی ستون میں وزیر اعظم سے لے پٹواری تک، سیاسی ستون میں قومی اسمبلی سے لیکر یونین کونسل تک ان تمام میں اگر وہ چاہیں بھی تو گھر گھر نہیں ملاقات کر سکتے۔ پھر جو تیسرا ستون ہے جسے وہ سماجی و اقتصادی ستون کہتے تھے۔ اس کی مکمل بنیاد یہی

شرکاءِ کانفرنس کا انہماک

ہے کہ غریب سے غریب خاتون یا مرد میں اپنی حالت بہتر کرنے کی صلاحیت ہے، آپ کو ان کے ساتھ بیٹھ کر ایک micro investment plan بنانا پڑے گا کہ آپ میں صلاحیت کیا ہے اور آپ اس کو کیوں بروئے کار نہیں لاسکتے۔ اس میں اہم نکتہ یہی تھا کہ یہ کام کون کرے گا۔ اس میں تینوں ستون کا کام ہے۔ ایسا نہیں کہ تینوں ستون میں سے کوئی بھی ایک یہ کام کرلے۔ جیسے آپ نے سندھ کا ذکر کیا۔ میں سندھ میں کوئی 20 سال سے زیادہ عرصہ سے کام کررہا ہوں۔ جب 2003 میں Sind Rural Support Programme بنا تھا۔ میرا جو ہندوستان میں تجربہ تھا وہاں میں نے دیکھا کہ حکومت اور دیگر ستون کے مل کر کام کرنے کے نتیجہ میں دس سال کے عرصہ میں کام مزید بڑھا اور مزید ستون بنتے گئے۔ کوئی 20 سال کے عرصہ میں 2 ملین

کے قریب خواتین اس طرح سے منظم ہوگئی ہیں ۔اور ان کے ساتھ وہ کام ہوا جو بظاہر چھوٹا کام تھا یعنی ان کی استعداد کتنی تھی مگر کام انہوں نے کس حد تک کیا ۔ابھی جتنے بھی ذرائع ہیں سب گورنمنٹ کے پاس ہیں لیکن گورنمنٹ service & supply کا کام کر رہی ہے اس کے علاوہ دیگر تو کوئی کام نہیں ۔ بات یہ ہے کہ وہ لوگوں کو چیزیں یعنی خدمات سہولیات پہنچائیں لیکن وہ ابھی تک نہ ہوا ۔empowerment of women میں جو کام ہوا ہے آپ خود جا کر دیکھیں کہ خواتین کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہیں ۔خاص طور پر میں یہ بات کہنا چاہتاہوں کہ پاکستان میں صوبائی حکومتیں بھی ہیں لیکن سندھ کو بہت برا بھلا کہا جاتا ہے لیکن کم از کم اس کام کو سامنے رکھیں کہ سندھ وہ واحد صوبہ ہے جہاں حکومت نے اس طرح کا کام کیا ہے ۔ بلاول بھٹو سے لیکر سب ہی لوگ اس کام کو اپناتے ہیں لیکن مجھے اس وقت کا انتظار ہے جب دوسرے محکمے والوں کو بھی پابند کیا جائے ۔ کچھ لوگوں نے کیا بھی ہے ایسا نہیں کہ انہوں نے بالکل بھی توجہ نہیں دی ۔جیسا کہ ڈپٹی کمشنر نے اپنے تمام محکموں کو پابند کیا کہ آپ تمام لوگوں کو مل کر یہ کام کرنا ہوگا۔

علی محب (طالب علم): شعیب سلطان صاحب سے میرا سوال ہے کہ مائیکرو فنانس ٹیوشن کو ہمیشہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے جنہوں نے landing کو کاروبار بنایا ہوا ہے ۔اس کے کچھ پہلو بھی ہیں یعنی کہ غریب لوگ قرضہ لینے کے بعد مزید اس میں پھنس جاتے ہیں ۔آپ تھوڑا اس کی بھی وضاحت کر دیجئے ۔

شعیب سلطان : آپ نے پہلے تو یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم کرتے کیا ہیں کیونکہ ہم قرضہ تو دیتے نہیں ہیں ۔ ہماری آرگنائزیشن کی انویسٹمنٹ کچھ اور رہی ہے ۔ہم نے انڈیا میں یہ بھی سیکھا کہ قرضہ دیکر واپس لینا مشکل ہی ہوتا ہے کیونکہ ان کے حالات کا اس میں بڑا دخل ہے ۔خواتین کو آرگنائز کرنا ان کے لیے فنڈ مہیا کرنا یہ اصل کام ہے ۔لیکن ہم ان سے کہتے یہی ہیں کہ آپ اسے استعمال نہ کریں بلکہ اسے مخصوص کاموں پر خرچ کریں اسے rev o lv e کریں ۔مائیکرو کریڈٹ والے مختلف چیزیں

کررہے ہیں کہ ان کا ریٹ 35 ، 37 فیصد یا اس سے بھی زیادہ ہے۔میں نے یہی دیکھا کہ جو غریب ہیں انہیں تو کچھ ملتا ہی نہیں ہے۔حکومت کا ایک پروگرام کامیاب پاکستان ہے جو بغیر کسی انٹرسٹ کے وہ قرض دے رہا ہے ۔یہ community investment fund سے بہت مختلف ہے کیونکہ اس میں وہ revolve کررہے ہیں خود استعمال کررہے ہیں اکثر میں نے دیکھا ہے کہ جو پیسہ وہ خود استعمال کررہے ہیں جہاں بیس پچیس لاکھ روپے لیے اسے چار پانچ سال میں revolve کرکے کروڑوں بنا لیے۔لہٰذا اسے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ micro investment fund الگ ہیں اور جو کمپنی مائیکرو کریڈٹ کا کام کررہی ہیں وہ بالکل مختلف ہے۔لیکن ان کا ریکارڈ بھی اتنا برا نہیں ہے۔لوگ کووڈ 19 سے پہلے اسے واپس تو کررہے تھے۔

ذیشان شوکی (پاکستان ڈیولپمنٹ نیٹ ورک): پاکستان میں رورل سپورٹ پروگرام ہے ۔ رورل سپورٹ نیٹ ورک بھی ہے ۔آغا خان رورل سپورٹ نیٹ ورک بھی ہے لیکن کوئی اربن سپورٹ پروگرام نہیں ہے ۔اربن علاقوں میں بھی بہت ساری کچی آبادیاں ہیں تو کیوں نہیں سول سوسائٹی اوراین جی اوز کو ملا کر کچھ کیا جائے ۔کیا اس پر غور کیا جارہا ہے۔

شعیب سلطان: اورنگی پائلٹ پروجیکٹ سے بہتر کون سا پروگرام ہوسکتا ہے ۔خان صاحب نے تو یہی کہا تھا نا کہ organic support ۔اربن میں یہ کام نہیں ہوسکتا جو میں رورل میں کیا ہے یہ بالکل بھی ممکن نہیں ہے ۔عارف بتائیں گے کہ چیف منسٹر آئے ان کے سامنے پریزنٹیشن دی ۔وہ متاثر ہوئے کہ بہت اچھا پروگرام ہے میں آپ کو پنجاب کے 4 ڈسٹرکٹ دیتا ہوں وہاں یہ کام شروع کریں ۔خان صاحب نے برملا جواب دیا کہ میں ٹھیکیدار نہیں ہوں ۔آپ لوگوں کو بھیج دیں ہم ان کی تربیت کریں گے ۔گورنمنٹ کے کام سے آپ واقف ہیں ۔اربن کے حوالے سے عارف آپ کو زیادہ بتائیں گے ۔او پی پی کو ہی دیکھ لیجئے کہ وہاں کون سے اربن مسائل نکل کر سامنے آئے ۔سینی ٹیشن ،صحت ،بیروزگاری ۔اور یہ سب انہوں نے او پی پی میں کرکے دکھایا۔ یہاں عارف اور تسنیم

بیٹھے ہوئے ہیں۔صحیح تو یہی بتا سکتے ہیں لیکن یہ شروع کیوں نہیں ہو رہا یہ تو ان کے ہاتھوں میں بھی نہیں ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار گورنر صاحب بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے ہماری ساری باتیں سننے کے بعد پھر وہیں سے دہرایا کہ اچھا ہم یہ کردیں گے ہم وہ کردیں گے۔لیکن اگر یہ تیار ہوں تو یہ سب پورے ملک میں ہوسکتا ہے جیسا کہ انہوں نے لودھراں میں کیا۔

ناصر منصور(ٹریڈ یونین): مختصر سوال یہ کہ ہم چھوٹے چھوٹے جزیرے بنالیتے ہیں کہ ہم نے یہاں پر یہ کام کیا ہے اور اب کیا اسے یونیورسلائز نہیں کیا جاسکتا کہ یہاں بسنے والے شہری کو ان کی بیروزگاری ،تعلیم دی جائے کیا یہ نہیں ہوسکتا۔رورل میں جو آپ لوگ کام کر رہے ہیں تو کیا اگر آپ وہ رشتہ یا تعلق تبدیل نہیں کرتے تو کیا اسے قائم رکھتے ہوئے اسے ڈیولپ کرسکتے ہیں۔

شعیب سلطان: اس سوال کا جواب عمران خان ہی دے سکتے ہیں۔باقی جو آپ کا دوسرا سوال ہے اس میں میں نے پہلے ہی کہا کہ انتظامی ستون میں زمینی حقائق کا جو فریم ورک ہے۔ہم نے اسے پاکستان بھر میں تلاش کیا almost over 5 hundred thousand community organization with 8 million rural house لیکن وہ اسے دیکھتے ہی نہیں ۔انہیں کچھ نظر ہی نہیں آتا۔انہوں نے سارے پیسے سماجی تحفظ میں، احساس پروگرام میں کئی بلین روپے لگادیئے ہیں ۔اسے ہزار دو ہزار روپے دیکر سب تو consumption میں خرچ ہوتا ہے۔

تاج حیدر: میں اس میں کچھ اضافہ کرنا چاہوں گا کہ ہمارے دوست نے جو جزیروں کی بات کی ۔اختر حمید چاچا نے بھی او پی پی کے لیے کچھ کہا تھا جس کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے کہ Yes its an island in an ocean but go and build an island. one day they shall be many. پھر میں نے ڈان میں ان کا آرٹیکل the rebirth of idealism پڑھا جس میں انہوں نے یہ بات کہی تھی کہ ہر علاقے کے اندر جو غریب طبقات

ہیں وہ کس طرح اپنے آپ کو منظم کر رہے ہیں ۔تنظیمیں بن رہی ہیں ۔ڈاکٹر شعیب سلطان نے فرمایا کہ کوئی پانچ ہزار کے قریب کمیونٹی آرگنائزیشن ہیں کس طرح ان میں سماجی شعور پیدا ہو رہا ہے کہ اپنے حالات بدلے جائیں پھر عارف حسن صاحب کا بھی ایک سروے ہے جس میں دیہی علاقوں کا وزٹ کیا اور دس سال بعد پھر انہی علاقوں میں گئے تو وہاں بہت تبدیلی آچکی تھی ۔خاص کر خواتین کے حوالے سے بہت تبدیلیاں آچکی تھیں ۔بچیاں مل کر کام کر رہی تھیں ۔وہ ملازمت میں آئیں ۔ یہ سب بہت اہم ہے ۔یہ جزیرے بڑھتے چلے جائیں گے جس طرح rebirth of idealism شائع ہوا۔میں نے یہ سب پڑھ کر اختر حمید چاچا کو فون کیا کہ چاچا یہ سب پڑھ کر میں تو ہواؤں میں اڑ رہا ہوں ۔انہوں نے کہا کہ ہواؤں میں اڑنا چھوڑو واپس زمین پر آؤ ۔پھر کہا کہ ایک بات بتاؤ کہ یہ برے لوگ بھلے کسی بھی کمیونٹی کے ہوں کوئی بھی زبان بولنے والے ہوں یہ فوراً آپس میں مل جاتے ہیں ۔اچھے لوگ آپس میں کیوں نہیں ملتے ۔ یہ واقعی ایک گُر ہے کہ جتنے لوگ بھی اچھے کام کر رہے ہیں انہیں آپس میں مضبوط کیا جائے ۔ان کا آپس میں ملاپ ہو جائے تو یہ جزیرے جزیرے نہیں رہیں گے ۔

منصور رضا: گفتگو بہت عالمانہ ہو رہی ہے ہمارے کچھ دوستوں کے پاس مزید سوالات ہیں لیکن وقت کی کمی ہے اسی لیے ہم چائے کا وقفہ لیتے ہیں ۔اس کے بعد نئے سیشن کے ساتھ حاضر ہونگے ۔

☆------------- ☆------------- ☆

دوسرا سیشن

شہری ترقیاتی منصوبوں میں
ڈاکٹر اختر حمید خان کی شمولیت

فہرست

دوسرا سیشن

”شہری ترقیاتی منصوبوں میں ڈاکٹر اختر حمید خان کی شمولیت“

مقررین		صفحہ نمبر
مجتبیٰ رضوی	نغمہ سرا	58
عارف حسن	مقررِ خاص	59
فضل نور	سہولت کار	71
تسنیم احمد صدیقی	مقرر	72
مصطفیٰ بلوچ	مقرر	80
محمد یونس	مقرر	88
سمیرا گل	مقررہ	91
حافظ راشد	مقررہ	92
سوال جواب	مہمان شرکاء	93

دوسرا سیشن

شہری ترقیاتی منصوبوں میں ڈاکٹر اختر حمید خان کی شمولیت

انعم مفتی: اپنے دوسرے سیشن کا آغاز ہم ڈاکٹر اختر حمید صاحب کے کلام سے ہی کریں گے۔ مجتبیٰ رضوی سے درخواست ہے کہ وہ ہمیں ڈاکٹر صاحب کا کلام سنائیں۔

کبھی کبھی غمِ دنیا کو بھول جانے دو
دریچے کھول دو ٹھنڈی ہوا کو آنے دو

ہزار شہر بسائے ہیں بادشاہوں نے
اب ایک شہر فقیروں کو بھی بسانے دو

تمھارے کھیت کی مٹی اگلتی ہے سونا
مجھے درختِ محبت یہاں لگانے دو

تمھیں وصال کی سرگوشیاں مبارک ہوں
مجھے فراق کی شورش کا لطف اٹھانے دو

میرے بیان میں ہو گی بلا کی شیرینی
مجھے ایک رات داستاں سنانے دو

کہا جو میں نے مجھے عشق ہے خدا کی قسم
وہ بولے خیر کہ اب اس تذکرہ کو جانے دو

انعم مفتی: بہت شکریہ مجتبیٰ۔ اب ہم باقاعدہ دوسرے سیشن کی طرف آتے ہیں ہمارا دوسرا

سیشن" ڈاکٹر اختر حمید کی شہری ترقیاتی منصوبوں میں شمولیت" ہے۔ Akhter Hameed Khan's contribution and involvement in urban public project۔

اس سیشن کے کی نوٹ اسپیکر جناب عارف حسن ہیں جو ایک معروف آرکیٹیکٹ اور شہری منصوبہ سازی کے ماہر جانے جاتے ہیں۔ 1968 میں باقاعدہ آرکیٹیکٹ کے طور پر اپنا کیریر شروع کیا۔ 1982 میں اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کی بنیاد رکھنے والوں میں سے تھے پھر 1989 میں اربن ریسورس سینٹر کراچی کی بنیاد رکھی۔ بہت ساری کتابوں کے مصنف ہیں۔ ہلالِ امتیاز حاصل کر چکے ہیں۔ ہم ان کا استقبال کرتے ہیں جناب عارف حسن!

عارف حسن: بہت شکریہ۔ جناب! شعیب سلطان صاحب، تسنیم صدیقی صاحب، نعمان احمد صاحب، طلباء، اساتذہ، خواتین وحضرات۔ یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے کہ ڈاکٹر اختر حمید خان کے شہری ترقیاتی منصوبوں کے ساتھ میری وابستگی رہی ہے میں ان پر بات کروں۔ میں منتظمین کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے یہ موقع فراہم کیا۔

ڈاکٹر صاحب کے مقاصد اور کام کرنے کا طریقہ کار عمدہ اصولوں کے ساتھ قائم تھے جو روایتی انداز سے بہت مختلف نظر آتے تھے کیونکہ اس سے قبل روایتی نقطہ نظر میں صرف بڑے بڑے انفراسٹرکچر بنا کر شہر کے مختلف علاقوں کو اس سے انفرااسٹرکچر سے جوڑ دیا جاتا تھا چونکہ شہر کا بیشتر حصہ کبھی بھی اس انفرااسٹرکچر کا حصہ نہیں بنا تھا اسی لیے اس کا استعمال بھی کم ہی رہا۔

عارف حسن ڈاکٹر صاحب کے فلسفے کو اجاگر کرتے ہوئے

کراچی میں سیوریج ٹریٹمنٹ پلانٹ نمبر 2 اس کی واضح مثال ہے۔ 20 سال پہلے مکمل ہونے والے اس منصوبے کو سیوریج کے اعتبار سے ابھی تک استعمال نہیں کیا گیا ہے کیونکہ اس کی طرف جانے والی پائپ لائنوں کو اب بھی سیوریج نہیں ملتا۔ ان پائپ لائنوں کے علاوہ اس پر ایک خطیر رقم بھی خرچ کی گئی ہے جو (اب بھی خرچ کی جارہی ہے)۔ شہر میں اچھے انداز میں خدمات فراہم کرنے کے لیے مہنگے جزیرے بنائے گئے جو مالی وسائل اور افرادی قوت کے بغیر نہ تو قابل عمل ہیں اور نہ ہی ان میں کسی بھی قسم کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ جزیرے غیر محفوظ ہوتے گئے اور بالآخر ختم ہو گئے۔ کمیونٹی پروجیکٹ میں اکثریت لوگ مزدوری کرتے ہیں (جس کے لیے انہیں ادائیگی کی جاتی تھی) اور شاید ترقیاتی لاگت کا 5 فیصد حصہ ان مزدوروں کو معاوضہ کی صورت دیا جاتا رہا ہے لیکن پروجیکٹ کی مالی صورتِ حال کو یہ قابو نہیں کر پائے یا پھر مالی وسائل کے استعمال کی نوعیت کا تعین نہیں کر پائے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کا مقصد کمیونٹی کے لیے صفائی یا پانی کی فراہمی جیسے کام نہیں تھے بلکہ ان کا اصل اور بنیادی مقصد کمیونٹی کی سطح پر تنظیمیں بنانا تھا جو ترقی سے نمٹنے کے عمل میں با اختیار بنے اور جس سے کمیونٹی کے لوگوں کی زندگی آسان ہو سکے۔ وہ اپنی ضروریاتِ زندگی کو سمجھیں اور محلہ کی سطح پر بہتری لائیں۔ ان کا خیال تھا کہ کمیونٹی بے جا اخراجات کو کم کرسکتی ہے۔ وہ پیسوں کا انتظام کرسکتی ہے۔ اسے صرف ممکن ہی نہیں بنا سکتی بلکہ اس بات کا بھی تعین کرسکتی ہے کہ محلہ کی سطح پر ان کے مفاد کے لیے انہیں کس طرح استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس پورے عمل سے کمیونٹی کو با اختیار بنانے میں مدد ملے گی اور آپس میں اور سرکاری اداروں کے ساتھ تعلقات مزید مضبوط ہو جائیں گے۔ اس کے نتیجے میں صحت، تعلیم اور انفراسٹرکچر کے انتظام میں یقینی بہتری آئے گی۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ استدلال اس حقیقت سے پیدا ہوا کہ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ہم جسمانی اور سماجی انحطاط کے ایک مشکل دور میں جی رہے ہیں جس کے نتیجے میں ہم کمیونٹی کے ان اداروں کو

کھو چکے ہیں جہاں متفقہ فیصلہ سازی اور اجتماعی عمل ہوا کرتا تھا۔ مثلاً پنچایت، مکھی، پٹیل، نمبردار وقت کے ساتھ یہ سب ختم ہو چکے۔ اب اس سماجی انحطاط کے عمل میں ذات پات اور برادری کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔

وہ لوگ جو ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے وہ بھی شہر کی کم آمدنی والی بستیوں میں اکٹھے رہتے تھے۔ آپس میں مل جل کر رہنا ان کی ضرورت تھی تاکہ باہمی طور پر" ان کے فوائد کی حفاظت اور اپنے دعوؤں کو فروغ ملے" ساتھ ہی وہ اپنے معاملات کو ریاست کے ساتھ بھی جوڑ سکیں۔

مجھے 1981 میں اورنگی پائلٹ پراجیکٹ بلایا گیا جس کا مقصد یہی تھا کہ او پی پی کے پلیٹ فارم سے اورنگی میں جو سیوریج اور سینی ٹیشن کا کام ہو رہا ہے اسے دیکھا جائے۔ اور یوں میں نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ مل کر کام کیا۔ میرا ان کے ساتھ ایک ایسا سلسلہ شروع ہو گیا جو ان کی وفات تک جاری رہا۔ 1999 میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس عرصے کے دوران میں نے اس منصوبے کی ساخت اور مستقبل میں اس کے اثرات، اس منصوبے کی ترقی اور فیصلے کے عمل کو دستاویزی شکل دی۔ اس دوران جو فیصلے کئے گئے وہ روایتی طریقے سے بالکل برعکس تھے۔ میں یہاں ان فیصلوں سے متعلق بتانا چاہوں گا۔

۞ 80 کی دہائی کے اوائل میں ہمارے ڈونر BCCI نے UNCHS کو ایڈوائزر کے طور پر مقرر کیا تھا۔ وہ اور بی سی سی آئی چاہتے تھے کہ ہمارا دفتر شہر میں ہو تاکہ ترقیاتی معاملات پر فیصلہ سازی کرنے والے سرکاری ادارے ان سے قریب رہیں۔ وہ ایئر کنڈیشن کے ساتھ ایک پوش آفس چاہتے تھے تاکہ بین الاقوامی ڈونرز اور پروفیشنل حضرات وہاں نہ صرف پرسکون ماحول محسوس کریں بلکہ اس تنظیم کو معتبر بھی جانیں۔ دوسری طرف ڈاکٹر صاحب کی خواہش تھی کہ او پی پی کا دفتر اورنگی کے محنت کش طبقے کے محلہ میں قائم کیا جائے۔ جس میں ایر کنڈیشنر یا چمکدار فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں ہونی چاہیے۔ وہ چاہتے تھے کہ جو بھی او پی پی کے دفتر میں جائے اسے

اجنبیت محسوس نہ ہو بلکہ گھر جیسا ماحول لگے۔

۞ او پی پی کے ڈونرز UNCHS کا یہ بھی خیال تھا کہ او پی پی انتظامیہ کے افراد سماجی علوم میں یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونا چاہیے۔اس بات سے ڈاکٹر صاحب نے اختلاف کیا۔وہ کہتے تھے کہ سماجی منتظمین کا تعلق کمیونٹی سے ہونا چاہئے کیونکہ وہ نہ صرف کمیونٹی کو جانتے ہیں۔بلکہ ان کے آپس کے تعلقات،کمیونٹی کی تنظیمی طاقت،صلاحیت اور ان کی ضروریات کو اچھے سے جانتے ہیں۔البتہ گریجویٹس حضرات کو پروجیکٹ کی دیکھ بھال اور اسے ڈاکیومنٹ کرنے کی ذمہ داری دینی چاہیے۔اس طرح سے وہ بھی کمیونٹی کے حوالہ سے بہت کچھ سیکھ کر ایک اچھا اثاثہ بن سکتے ہیں۔

۞ صفائی کے منصوبے کے لیے اورنگی کے فزیکل سروے کی ضرورت تھی۔ان دنوں گوگل جیسی سہولیات نہیں تھیں۔ہمارے اقوام متحدہ کے مشیر نے سروے کرنے والی کمپنیوں سے اس کی فیس دریافت کی۔تو فیس کا سنکر ڈاکٹر صاحب گھبرا گئے کیونکہ" یہ منصوبے کی کل لاگت کے تناسب سے نہیں تھا۔" انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا یہ سروے طلباء کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے۔ میں نے اس کی تائید کی اور کہا کہ بالکل ایسا ہوسکتا ہے اسی لیے ہم نے اس سروے کے انتظامات بھی کر لیے۔این ای ڈی یونیورسٹی اور داوٗد کالج کے 40 طلباء کو ہم نے اس کام میں شامل کیا انہیں کسی بھی قسم کا سامان نہیں دیا گیا۔سروے کے لیے ان کے پاس صرف پیمائش کرنے کے لیے ٹیپ موجود تھے۔

۞ اخراجات بچانے کے علاوہ،بھی سروے میں طلباء کی شمولیت کے بہت سے فوائد تھے۔طالب علم بالکل سادہ انداز میں چائے کے کھوکھے پر بات چیت کرتے،بحث کرتے ہیں اور یوں جب 40 طلباء کی اورنگی میں آمدورفت ہوئی تو اورنگی کے رہائشیوں کو معلوم ہوا کہ یہ منصوبہ کیا ہے۔اس منصوبے کے فائدے اور نقصانات پر بحث ہونے لگی۔دوسری طرف،طلباء نے یہ

بھی سیکھا کہ دراصل کچی آبادی کیا ہوتی ہے اور اس کے مکین کس نوعیت یا مزاج کے ہوتے ہیں؟ وہ اس فہم کو اپنے ساتھ واپس یونیورسٹیوں میں لے گئے اور سرکاری سطح پر ان کی شمولیت، OPP کے ساتھ قائم ہوئی اور اس کے بعد سے اب تک مسلسل برقرار ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ڈاکٹر منصور علی، جو یونیورسٹی آف لافبرو میں پروفیسر بنے، اور پھر کمیونٹی پر مبنی متعدد این جی اوز کے لیے عالمی سطح پر کام کیا۔ ڈاکٹر سہیل خان، جو اب بھی لافبورو میں پڑھاتے ہیں وہ بھی ان 40 طلبہ میں شامل تھے۔

۞ دوسرے مسئلہ پر جو اختلافِ رائے رہا وہ تنخواہوں کا تھا۔ ڈاکٹر صاحب چاہتے تھے کہ عملے کی تنخواہیں حکومت کے مطابق ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے مشیروں کی رائے میں یہ تنخواہیں بہت کم تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ وہ زیادہ تنخواہیں دیگر کام کے لیے "صحیح قسم کے لوگ" حاصل نہیں کر پائیں گے۔ البتہ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ اگر اورنگی کے لوگوں کو بھرتی کیا جائے تو وہ ان تنخواہوں سے بہت خوش ہوں گے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ان کا انتخاب صحیح طریقے سے کیا جائے تو اُن کی پیشہ ورانہ تربیت کی جا سکتی ہے۔ وقت نے اورنگی میں ہمارے اس تجربہ کو درست ثابت کیا ہے۔۔

۞ جب مجھ سے OPP کا نیا دفتر ڈیزائن کرنے لے لیے کہا گیا تو ڈاکٹر صاحب نے اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور نہ ہی مجھے کوئی تجویز یا مشورہ دیا۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے مجھ سے صرف ایک بات کہی تھی کہ "او پی پی کا دفتر ایسا ہو کہ کچی آبادی لگے۔" وہاں کوئی ایئر کنڈیشنگ، کوئی پوش فرنیچر، پرشکوہ عمارت نہ تھی اور نہ ہی کوئی ایسی بڑی لیبارٹری تھی کہ جہاں توانائی اور جنگلات سے متعلق تجربات کیے جا سکیں۔ ڈاکٹر صاحب صرف حاصل شدہ نتائج سے خوش تھے لیکن انہوں نے ہمارے تیار کردہ نئے فرنیچر کو استعمال نہ کیا وہی پرانا فرنیچر ان کے زیرِ استعمال تھا۔

۞ 1980 کی دہائی کے وسط میں ایک وقت ایسا آیا کہ او پی پی کو نہ صرف کراچی بلکہ پاکستان کے دیگر علاقوں سے بھی کمیونٹیز کی جانب سے درخواستیں موصول ہونے لگیں ان سب

سے کہا گیا کہ آپ بھی وہی کام کریں جو ہم اورنگی میں کر رہے تھے۔ہم ان کے ساتھ اس کام میں شامل ہو گئے۔ڈاکٹر صاحب نے ہمیں نہیں روکا بلکہ کہا "کرکے دیکھ لیں"۔او پی پی کے ڈونرز اور اقوام متحدہ نے پہلے ان علاقوں میں چھوٹے دفاتر قائم کرنے کی تجویز دی تھی جن پر ہم کام کر رہے تھے لیکن جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا، ہم ایک بہت بڑی بیوروکریسی بنائیں گے جو صفائی کے مسئلہ سے بھی زیادہ اہم ہوگا۔کمیونٹی کی مدد کمیونٹی کے ہی مالی اخراجات سے ممکن ہوگی۔

۞ ایک حل یہ بھی پیش کیا گیا کہ ایک ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جائے جہاں لوگ آئیں، تربیت حاصل کرکے اپنے علاقوں میں واپس جائیں اور جو کچھ انہوں نے کمیونٹی کو (او پی پی کو) اورنگی میں کرتے دیکھا اسے وہاں بھی نافذ کرسکیں۔ اس کے نتیجے میں 1987 میں OPP ریسرچ اینڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ (RTI) کا قیام عمل میں آیا۔ یہ تربیت کمیونٹی کے منتخب کردہ افراد کے لیے تھی۔عام طور پر دو کارکن جو سماجی کارکنان کے طور پر کام کریں گے ان میں ایک تکنیکی شخص (ترجیحی طور پر ایک پلمبر)،تربیت میں مالیات کا حساب رکھنا،منصوبہ کی نگرانی، کمیونٹی کے لوگوں کی تنظیم سازی اور سیوریج لائن بنانے کے لیے ہنرمند افراد کی حوصلہ افزائی اور اس سارے عمل کو لکھنا شامل تھا۔

۞ تربیت کی نوعیت صرف نظریاتی نہیں تھی بلکہ یہ ادارہ اوراس کے عملی کام پر مبنی تھا۔ جب بھی کمیونٹی نے گلیوں میں کام شروع کیا مقامی حکومت نے مداخلت کی اور عموماً انہیں روکنے کی کوشش کی۔ایسے وقت میں کمیونٹیز نے مقامی حکومت کو OPP کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کا مشورہ دیا۔اس کی وجہ سے کمیونٹی افسران نے کراچی میں OPP کے دفاتر کا دورہ کیا۔ جس کے بعد وہ اکثریت میں اپنے دائرہ اختیار کے تحت اس او پی پی کے اس پروگرام کے حامی بن گئے۔

۞ اس عمل کے ذریعے 859,77 گھرانوں پر مشتمل 6459 گلیوں نے 651

سے زیادہ بیت الخلاء بنائے اور سیوریج کا نظام ڈالا۔ 2017 تک اورنگی سے باہر 206 ملین روپے کی سرمایہ کاری کی۔اورنگی کے مکین ہی سماجی کارکنان تھے ظاہر ہے وہ کمیونٹی ارکان بھی تھے۔ جس میں ایک پلمبر، رکشہ ڈرائیور، کنٹریکٹر اور ریلینڈ ڈویلپر تھے۔

ڈاکٹر صاحب صرف میرے ہی نہیں بلکہ میری شاگردہ ساتھی پروین رحمان کے بھی استاد تھے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر صاحب نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ پروین نے اورنگی کے لوگوں کی نفسیات سمجھنے میں ان کی مدد کی۔اہم سماجی کارکنان جو اب انتقال کر گئے ہیں نور محمد سیفی، حفیظ آرائیں اور رمضان قریشی تھے۔ان کے طالب علم پورے پاکستان میں کمیونٹی پراجیکٹس پر کام کر رہے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ان کارکنان کی تصاویر او پی پی کی عمارت کے داخلی دروازے پر لگائی جانی چاہئیں۔

سینی ٹیشن پروگرام:

سینی ٹیشن کا پروگرام OPP کا سب سے اہم پروگرام رہا ہے۔اسے پوری دنیا میں بین الاقوامی ایجنسیوں، این جی اوز اور تعلیمی اداروں نے اپناتے ہوئے فروغ دیا ہے۔ OPP نے اپنے تجربے کی دستاویزات، تکنیکی اور انتظامی رہنمائی ان علاقوں یا اداروں میں فراہم کی ہے جہاں اسے فزیکلی طور پر لاگو کیا گیا تھا۔میں خود سینی ٹیشن پروگرام کے توسط سے ہی اورنگی پائلٹ پروجیکٹ سے متعارف ہوا اور اس کا حصہ بنا۔غلام کبریا صاحب مجھے او پی پی اسی لیے لیکر گئے تھے تا کہ میں سینی ٹیشن پروگرام کی ناکامی کے اسباب کو نہ صرف تلاش کر سکوں بلکہ ان ناکامیوں کا ازالہ بھی کر سکوں۔

ڈاکٹر صاحب سے میری ابتدائی گفتگو میں انہوں نے مجھ سے دو سوال پوچھے:

1. سینی ٹیشن پروگرام اتنا مہنگا کیوں تھا کہ حکومت اسے کچی آبادیوں کے لیے بڑے قرضے لیے بغیر تیار نہیں کر سکی جس کی وجہ سے یہ پروگرام غیر پائیدار اور ناقابل عمل بنا۔

2. کیا محلہ کے سینی ٹیشن پروگرام کو اس سطح تک سستا بنایا جاسکتا ہے جسے لوگ اپنے مالی اور تکنیکی وسائل کے ذریعے اس کی تعمیر کا انتظام کرسکیں؟ اگر نہیں، تو ہم سیوریج کے سمندر میں صرف مہنگے سیوریج سے پاک جزیرے ہی بنائیں گے جو بالآخر انہیں کھا جائیں گے۔

ہم نے چھان بین کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ مہنگا تھا کیونکہ حکومت کے اس ترقیاتی منصوبہ کی لاگت، مزدوری اور اس میں شامل سامان کی لاگت سے پانچ گنا زیادہ تھی (یہ صرف بدعنوانی کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ پرانے اور روایتی ٹینڈرنگ کے طریقے اور ڈیزائن کے معیارات کی وجہ سے تھا) اور جب اس منصوبے میں غیر ملکی قرضے شامل ہوتے تو یہ مزدوری اور سامان کی لاگت سے مزید دس گنا تک بڑھ جاتا تھا۔ بین الاقوامی ٹینڈر کی صورت میں یہ اور بھی بڑھ سکتا تھا۔ نتیجتاً ایسی چیز جس میں محنت اور سامان کی لاگت کو روپے میں ہی دیکھا جاتا تھا۔ کی محنت اور مادی لاگت روپے تھی۔ جس چیز پر لاگت ایک روپیہ آرہی ہے اس کی قیمت اب 10 سے 15 روپے ہو جائے گی اور یہ IFIs سے مشروط تھا۔ ان کی شرائط میں ہماری کرنسی کی گرتی ہوئی قیمت، غیر ملکی کنسلٹنٹس، مہنگے دفاتر، ان کے اخراجات اور تکنیکی معاون پروگراموں کی وجہ سے تھا واضح رہے کہ ان کے تکنیکی پروا گرام نے ہماری تکنیکی مہارت کو بڑھانے میں ہماری مدد نہیں کی تھی اسی لیے یہ کوئی حل نہیں تھا۔

ہم اس نتیجے پر بھی پہنچے کہ انجینئرنگ کے موجودہ معیارات کو نظر انداز کر کے اور ان کی جگہ نئے "معیارات" لگا کر اور ٹھیکیداروں کو ترقیاتی عمل سے ہٹا کر اخراجات کو کم کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمیں بتایا تھا کہ لوگ خوشی خوشی روپے دیں گے۔ گٹر لائن ڈالنے کے لیے 600 روپے فی گھرانہ رقم سوچی گئی تھی۔ یہی ہمارا ہدف تھا۔ جبکہ سرکاری سطح پر ان منصوبوں کے لیے 4000 روپے رکھے گئے تھے لیکن جب او پی پی نے کام کیا تو یہی رقم 600 سے 900 روپے کے درمیان آگئی تھی۔ اس سے OPP کی کمیونٹی کے ساتھ اشتراکیت کا ماڈل سامنے آیا جس نے مالی

اشتراک کے روایتی ماڈل میں موجود سماجی، افسر شاہی اور مالیاتی پیچیدگیوں کو دور کیا۔
یہ اشتراکی ماڈل دو اجزاء پر مشتمل تھا:

1. **اندرونی جز:** یہ او پی پی کی تکنیکی رہنمائی اور انتظامی مشورے کے ساتھ مقامی تنظیم کو اپنی قیمت پر کرنا تھا۔ جو ان چیزوں پر مشتمل تھا جس میں ہر مکان میں ایک لیٹرین، سیوریج لائن اور آس پاس کی مشترکہ گٹر لائن تھی۔

2. **بیرونی جز:** مکان سے باہر کا ترقیاتی منصوبہ حکومت کی طرف سے کیا جائے گا جس کے اجزاء میں سیوریج لائن، ٹریٹمنٹ پلانٹس اور ڈسپوزل پوائنٹس شامل ہونگے۔

گلی کی لائن کو تنظیم کی اکائی کے طور پر چنا گیا تھا کیونکہ اس میں 20 تا40 سے زیادہ مکانات نہیں تھے اسی لیے ان میں اعتماد اور ہم آہنگی کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے لین مینیجر اور خزانچی کو منتخب کیا۔ منتخب کیا یا نامزد کیا جو بھی آپ سمجھیں۔ جسے OPP تکنیکی اور انتظامی مشاورت دیا کرتی تھی۔ او پی پی نے عوام کے پیسے کو ہاتھ نہیں لگایا اور نہ ہی ان پر کسی قسم کا دباؤ ڈالا کہ اسے کیسے خرچ کیا جائے۔ اس کے علاوہ، OPP نے کمیونٹی کے اندر کوئی تنازعات حل نہیں کیے لیکن OPP کا اتنا کہنا ضرور تھا کہ تکنیکی تربیت اور رہنمائی دینے سے پہلے کمیونٹی کے تنازعات کو حل کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کمیونٹیز کے لیے اپنے تنازعات کو حل کرنے کے لیے ایک اچھی ترغیب تھی اور اس کے نتیجے میں ان کی ہم آہنگی کے ساتھ ایک دوسرے کو سمجھنے کو تقویت ملی۔ اس عمل کے نتیجے میں 2017 تک اورنگی میں 636,189 مکانات (98 فیصد) نے اپنے سیوریج کے نظام کو تعمیر کیا اور 168 ملین روپے کی سرمایہ کاری کی۔

ہماری ٹیکنالوجی پر بہت سارے اعتراضات بھی تھے۔ جیسا کہ انجینئرز نے پیش گوئی کی کہ یہ نظام فیل ہو جائے گا اور بند ہو جائے گا کیونکہ ان کے نزدیک یہ طے شدہ معیارات پر عمل نہیں کر رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان خدشات کو نظر انداز کیا۔ لیکن پھر سینی ٹیشن پروگرام کے ماہر جان پکفورڈ جو

لافبو رو یونیورسٹی کے پروفیسر ایمریٹس تھے۔انہوں نے او پی پی کا دورہ کیا۔ان کے دورے کے بعد، ڈاکٹر صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ" پک فورڈ کہتا ہے کہ آپ نیم حکیم ہیں اور آپ کا یہ تیار کردہ طریقہ کسی نظام کے تحت نہیں ہے۔ان کا کہنا ہے کہ یہ لوگوں کے وسائل کا ضیاع ہے اور آپ کو اسے فوری طور پر روکنا چاہیے۔'' میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ" میں ایک خیالی کام کرنے والا ہوں۔ سینی ٹیشن میں میری کوئی اہلیت نہیں ہے، لیکن میں آپ کو اس کا بہترین سینیٹیشن انجینئر دوں گا۔'' انہوں نے کہا'' وہ آئے گا، لمبی چوڑی فیس مانگے گا جو لوگ برداشت نہیں کرسکیں گے۔اور پھر تجزیہ ایسا ہوگا کہ بس پروگرام کا خاتمہ ہوگا''۔میں نے کومیلا میں اس کا تجربہ کیا ہے۔آپ بھی کام کرتے رہے ہیں۔ہم ایک ساتھ ڈوبیں گے یا تیریں گے۔

جب پکفورڈ واپس آیا تو وہ حیران رہ گیا کہ او پی پی کا یہ سسٹم اب بھی کام کر رہا ہے۔اس نے مجھ سے اس پر خرچ ہونے والی لاگت کا میرا حساب پوچھا اور حیران رہ گیا جب میں نے کہا کہ "کوئی حساب نہیں تھا۔صرف مشاہدات، عقل، اور وجدان۔" اس نے ہمیں تجویز دی کہ اگر مالیات کو بھی شمار کیا جائے تو نتیجہ صحیح حسابات تیار کیے جائیں تو نتیجہ پیٹنٹ بھی ہوسکتا ہے۔یقیناً ہمیں ایسا کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔اس کے بعد، اس نے اپنے طالب علموں کو OPP سسٹم کے اردگرد حسابات کو سمجھنے اور تیار کرنے کے لیے بھیجا تھا۔مجھے نہیں معلوم کہ اس میں کیا آیا۔

ایک بار ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ OPP جن اصولوں پر کام کرتی ہے۔ان اصولوں سے میں نے کیا سیکھا ہے۔میں نے اس سوال کے جواب کے لیے دو دن کا وقت مانگا اور ان جوابات کو درج ذیل شکل میں پیش کیا۔

1. پروجیکٹ میں (اشرافیہ اور انتظامی اداروں کی سوچ کے خلاف) ایک عوامی تعصب ہونا چاہیے۔" یہ اس کے الفاظ ہیں جس میں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

2. اس میں باخبر عوام ہونا ضروری ہے۔" یہ بھی ان کے الفاظ ہیں اور ایسی باخبر عوام کو پیدا

کرنے کے لیے انہوں نے سمیع مصطفیٰ (جو ہمارے ساتھ کام کرتے تھے) اور میں نے اخبارات کے ایڈیٹرز کے ساتھ ملاقاتیں کیں۔ صحافیوں کو پراجیکٹ کا دورہ کرنے کی دعوت دی، یونیورسٹیوں اور متعلقہ تربیتی اداروں میں جا کر اس پروگرام کے بارے میں بات کی، پریزنٹیشن دیں۔ اور ان سے کہا کہ وہ ہمارے بارے میں لکھیں اور دوسروں کو سکھائیں۔ اس کے علاوہ کچی آبادیوں اور ان کے مسائل کے حوالے سے اردو میں ایک خبرنامہ بھی شروع کیا گیا جو ملک بھر کے مختلف اداروں اور کمیونٹی تنظیموں کو بھیجا گیا۔

3. قابل برداشت ٹیکنالوجی ہمیشہ استعمال کرنے، انتظام کرنے اور بعد میں برقرار رکھنے میں آسان ہوتی ہے۔

4. پالیسی سازوں اور بیوروکریٹس کے ساتھ روابط۔ رابطہ سازی کا یہ عمل NIPA، اسٹاف کالج اور دیگر اداروں جیسے پلاننگ کمیشن کے سامنے پروگرام کی پیشکش کے ذریعے کیا گیا تھا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی شہرت اور ان کے کومیلا میں کیئے گئے کام کی وجہ سے ممکن ہوا۔

5. ترقیاتی امور پر بننے والے منصوبے عالمی بحث کا حصہ ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو یہ نرگسیت کے ساتھ ختم ہو جائے گا۔ نتیجے کے طور پر ابتدائی سالوں میں انہوں نے اصرار کیا کہ میں ترقیاتی یا سینی ٹیشن پروگرام پر بین الاقوامی جرائد کے لیے کم از کم دو مضمون لکھوں۔ جو میں نے کیا اور اس کے بعد سے اب تک میرا لکھنے کا عمل جاری ہے اگرچہ اس میں کبھی کبھی بے قاعدگی ہو جاتی ہے۔

میں نے یہ باتیں ڈاکٹر صاحب کے سامنے پیش کی تو انہوں نے کہا کہ ایک اہم نکتہ غائب ہے۔ جو کاؤنٹس سے متعلق ہے۔ انہیں شفاف ہونا چاہیے، ان کے بارے میں کوئی چیز چھپی یا خفیہ نہیں ہونی چاہیے، انھیں شائع کیا جانا چاہیے تاکہ عوام ان کا اندازہ لگا سکیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اکاؤنٹس اہم ہیں کیونکہ مالیات کا مطالعہ کرنے سے، کوئی بھی اس تنظیم کی نوعیت کو سمجھ سکتا ہے جس نے انہیں پیش کیا تھا۔ ایک ایک پائی کا حساب ہونا چاہیے۔

پروجیکٹ کی کامیابی کا ڈاکٹر صاحب کے ساتھ بہت گہرا تعلق تھا۔انہوں نے تمام کمیونٹی کو ان کی اپنی انفرادیت کی خاصیت کی بناء پر قبول کیا۔انہوں نے اپنے خطوط کے لفافے کبھی نہیں پھینکے بلکہ انہیں لکھنے کے کاغذ کے طور پر استعمال کیا۔ پروین نے بھی ایسا ہی کیا لیکن ان کا انداز جمالیاتی تھا۔اس کے لیے وہ مختلف سائز کے لفافے اور مختلف سائز کے تحریری پیڈ بناتے تھے۔ڈاکٹر صاحب کی سوچ میں ہی وہ ڈھل گئے تھے۔ان سب باتوں کے علاوہ وہ عربی، فارسی اور اردو کے اسکالر تھے جو نہ صرف ان عوامل پر اپنے انداز سے بات کیا کرتے تھے بلکہ روزمرہ کی زندگی میں ان کے مشوروں پر بھی عمل کیا جاتا۔نتیجتاً وہ ایک کفایت شعار اور کم خرچ واقعہ ہوئے تھے۔ان کی بیوی کا کہنا ہے کہ ان کے پاس قمیض شلوار کے صرف دو جوڑے تھے۔ایک جوڑا روزانہ دھلتا تھا۔دوسرا استعمال ہوتا تھا۔ان کے نزدیک اس طرح زندگی آسان ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں سوچ بھی زیادہ بہتر ہوجاتی ہے۔ورزش کے طور پر، وہ اکثر کھیلتے تھے۔اپنے اس کھیل کو وہ "غریب آدمی کا گولف" کہتے تھے۔جو ایک کھلے علاقے میں ہاکی کی مدد سے گیند کو مارنے اور اسکے پیچھے بھاگنے کا کھیل تھا۔مجھے دو مواقع پر اس کے ساتھ "غریب آدمی کا گالف" کھیلنے کا شرف حاصل ہوا۔

انعم مفتی: بہت شکریہ عارف صاحب آپ نے ڈاکٹر صاحب کے کام اور شخصیت کو بہت اچھے سے بیان کیا۔اب ہم جناب فضل نور کو زحمت دیں گے کہ وہ ڈاکٹر اختر حمید خان ترقیاتی کانفرنس کے سیشن 2 کو ماڈریٹ کریں۔جناب فضل نور بذاتِ خود ایک آرکیٹیکٹ ہیں۔داؤد یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہیں جہاں انہوں نے دوسالہ آرکیٹیکٹ کی پریکٹس کی۔اس کے بعد ایشین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی سے وابستہ ہوئے جہاں مزید سیکھنے کا موقع ملا۔انہوں نے Human Settlement & Development پر تحقیقی کام کیا۔ان کا پیشہ ورانہ تجربہ دنیا کی مختلف آرگنائزیشن کے ساتھ رہا ہے جس میں اقوام متحدہ بھی شامل ہے۔تعلیمی اور تحقیقی کاموں میں ان کا بہت کام رہا ہے۔انہوں نے بہت سے تحقیقی مقالے لکھے ہیں۔اکیڈمی تحقیق میں ان کا بڑا کام ہے۔آج کل سرسید

یونیورسٹی کے شعبہ آرکیٹیکٹ اینڈ ڈیزائننگ میں چیئر پرسن ہیں۔

فضل نور: السلام علیکم! آج کے دوسرے پینل میں آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔آج صبح سے جس طرح گفتگو ہو رہی ہے۔زندگی کی مختلف جہتیں معلوم ہو رہی ہیں، بالخصوص جب کرامت صاحب کو سنا تو انہوں نے کہا تھا کہ تین لوگ علی گڑھ سے چلے تھے جو CPS سے ہوتے ہوئے کومیلا سے کراچی، مشین گن، شمالی علاقہ جات سے تجربات سمیٹتے رہے۔آج ہماری پانچویں یا چھٹی نسل اس وقت یہاں ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو سن رہی ہے۔اور یہ جو خیالات کا سفر ہے اب یہ اگلی نسل میں داخل ہوا چاہتا ہے۔ پہلے یہ پروگرام فورم کی صورت ہر سال اورنگی پائلٹ پروجیکٹ میں ہوتا رہا لیکن پروین رحمان کے بعد یہ رک گیا تھا۔میں ڈاکٹر نعمان احمد کو اس کی مبارکباد دینا چاہتا ہوں جنہوں نے اس سلسلہ کو دوبارہ شروع کیا۔گفتگو، مباحثہ اور نئے نئے خیالات پیش کرنا یہ سب فورم میں بہت اہم ہوتا ہے۔میں پروگرام کو آگے بڑھانے کے لیے جناب تسنیم احمد صدیقی صاحب کو زحمت دوں گا کہ وہ اپنی نشست پر آئیں۔

تسنیم صاحب سے میری پہلی ملاقات اورنگی پائلٹ پروجیکٹ میں ہوئی جہاں وہ Rural Development دیکھنے آئے تھے ۔اس وقت وہاں پروین رحمان بھی موجود تھیں۔میں نے ان سے سوال کیا کہ یہ صاحب کون ہیں تو انہوں نے بتایا کہ یہ گورنمنٹ کے بیوروکریٹ ہیں۔میں نے تعجب سے کہا کہ پھر یہ اورنگی میں کیا rural development دیکھنے آئے ہیں تو کہنے لگیں کی ڈاکٹر صاحب نے بلایا ہے تو یقیناً اس میں کوئی بات ہوگی۔میں نے تسنیم صاحب کو اپنے کام میں مشاق پایا۔ان کے ساتھ

پینلسٹ مہمان اپنے تاثرات کا اظہار کر رہے ہیں

میرا ابا قاعدہ تعارف ڈاکٹر لنڈن نے کروایا تھا۔جنہوں نے حیدرآباد خدا کی بستی میں ہاؤسنگ پر ورکشاپ بھی کی تھی ۔وہ دن اور آج کا دن ہے میں نے اپنے کام میں انہیں نہایت متحرک پایا۔ یہ ان چند پاکستانیوں میں سے ہیں جن کا کام بین القوامی سطح پر مانا بھی گیا ہے۔رہائشی یونٹ سے متعلق ان کی تجاویز اور خیالات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔

سمیرا گل صاحبہ اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں ۔انہوں نے اپنا پیغام وڈیو کی صورت یہاں بھیجا ہے ۔سمیرا گل صاحبہ بھی اپنے کام میں بہت فعال ہیں یہ سیاست داں بھی ہیں۔انہوں نے سیوریج کے منصوبے سے اپنا کام شروع کیا لیکن اس کے بعد وہ ری سائیکلنگ کی طرف چلی گئیں اور آج سیوریج ،ری سائیکلنگ پر ہمیں ان کا خاصا کام نظر آتا ہے ۔وہ ڈاکٹر اختر حمید خان ریسورس سینٹر کی چیئر پرسن ہیں جو راولپنڈی سے اپنا کام کر رہا ہے۔

ہمارے اگلے پینلسٹ مصطفیٰ بلوچ اور یونس بلوچ سے گزارش ہے کہ وہ بھی یہاں تشریف لے آئیں۔

اب ہم تسنیم صدیقی صاحب سے درخواست کریں گے کہ آج کی اس دوسری نشست پر ڈاکٹر صاحب کے حوالے سے اپنی گفتگو کریں ۔

تسنیم احمد صدیقی: بہت شکریہ! آج صبح سے جو گفتگو ہوتی رہی ہے ہمارے لیے بھی اس میں سننے کے لیے بہت کچھ ہے ۔میں اسی گفتگو بالخصوص عارف حسن کے پیپر پر اپنے کمنٹس دوں گا اور سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے کردار پر بھی بات کرنا چاہوں گا۔ڈاکٹر صاحب کے بارے میں جناب شعیب سلطان نے بہت تفصیلی گفتگو کی کہ کہاں کہاں انہوں نے کام کیا اور کہاں کہاں سے نکالے گئے ۔ان پر جو بھی مقدمات ہوئے ۔الزامات لگے اس کا مقابلہ انہوں نے کیسے کیا۔اب اس پر جانے کی ضرورت نہیں رہی۔عارف صاحب نے اربن ایشو کے حوالے سے کہا کیونکہ آج کی گفتگو ہی اسی پہلو پر ہے ۔عارف صاحب نے اپنے ابتدائی دور میں جو تعلقات رہے اس پر روشنی ڈالی ۔ڈاکٹر

صاحب کا طریقہ کار کیا تھا اس میں جو پہلی بات میں نے دیکھی کہ وہ چیزوں کا مشاہدہ کیا کرتے تھے۔ جب اورنگی میں انہوں نے دفتر بنالیا تو ایسا نہیں کہ فوراً کام شروع کر دیا وہ کوئی بلیو پرنٹ لیکر نہیں آئے تھے۔ کوئی مہنگے منصوبے نہیں بنائے تھے۔کوئی ڈیزائن نہیں بنایا تھا جیسا کہ عارف صاحب اور شعیب سلطان نے بھی بتایا کہ BCCI نے انہیں پیسہ دیا اور کہا کہ اسکول کھول لیں، کالج کھول لیں لیکن انہوں نے کہا کہ کچی آبادی میں کام کرنا چاہتا ہوں۔مانگنے پر انہوں نے یہی کہا کہ میری ضرورت ایک پرانی جیپ اور 20 ہزار روپے ہے۔BCCI والوں کے لیے یہ رقم معمولی تھی سوانہوں نے فوراً ادا کر دی۔ وہ جیپ لیکر اورنگی میں نکل گئے۔اس وقت اورنگی نئی نئی آباد ہو رہی تھی۔حلانکہ وہاں کچھ لوگ پہلے سے رہ رہے تھے لیکن کچھ لوگ ہجرت کر کے آرہے تھے اور دلالوں کی مدد سے مکان بنا رہے تھے کیونکہ مشرقی پاکستان کا جو سانحہ ہوا تھا وہ بڑی تعداد میں آرہے تھے۔ پھر وہاں صنعتی علاقے نزدیک ہونے کی وجہ سے مزدور طبقہ بھی رہتا تھا۔انہوں نے گلیوں میں گھوم پھر کر دیکھا کہ یہاں کے کیا حالات ہیں اور یہی پہلا مرحلہ مشاہدہ کا تھا۔جس میں انہوں نے یہی دیکھا کہ یہاں لوگ خود دلالوں کے ذریعہ مکان بنوارہے ہیں۔ پلاٹ خرید رہے ہیں۔گورنمنٹ انہیں سہولیات مہیا نہیں کر رہی ہے۔ پانی، صحت، تعلیم کچھ بھی تو نہیں ہے۔انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ کچی آبادیاں ہیں یہاں حکومت کی طرف سے لوگوں کے لیے کچھ نظر نہیں آتا۔

پھر دوسرے مرحلہ پر انہوں نے لوگوں سے بات کی کہ آپ کے کیا مسائل ہیں اور آپ کیا چاہتے ہیں تو لوگوں نے کہا کہ ہماری گلیوں میں سینی ٹیشن کا بڑا مسئلہ ہے۔گندا پانی کھڑا رہتا ہے۔جس سے بیماریاں ہوتی ہیں۔ہماری عورتیں اور بچے بیمار ہی رہتے ہیں۔اس پر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ پھر آپ کیا چاہتے ہیں تو جواب ملا کہ ہم یہی چاہتے ہیں کہ حکومت ہمارا یہ مسئلہ حل کرے۔کے ڈی اے، کے ایم سی یا صوبائی حکومت کوئی بھی یہ کام کرے۔ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ان اداروں میں جائیے اور لوگوں سے ملاقات کیجئے اگر آپ کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے تو اچھی بات ہے۔پہلے کے ڈی اے

کے ڈائریکٹر جنرل کے پاس گئے انہوں نے ان مکینوں کو اندر داخل ہی نہیں ہونے دیا پھر کے ایم سی کے دفتر گئے تو انہوں نے کہا کہ یہ تو کچی آبادی ہے۔ہم یہاں پیسہ خرچ نہیں کر سکتے ۔ یہ غیر قانونی ہے۔ یہ قبضہ ہے۔ یہ لوگ وہاں سے بھی واپس آگئے۔اب کیا کیا جائے۔اس پر غور ہونے لگا۔طے ہوا کہ گورنر صاحب سے ملاقات کی جائے ۔اس وقت لیفٹیننٹ جنرل عباسی صاحب گورنر تھے۔لیکن ان کے اسٹاف نے بھی اندر داخل نہ ہونے دیا اور یہ بے چارے پھر واپس آگئے ۔ اس سارے عمل میں 2 سال گزر گئے۔ 80 سے 1982 آگیا۔ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ لوگوں نے دیکھ لیا کہ گورنمنٹ کچھ بھی نہیں کر رہی ۔ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اگر آپ اور انتظار کرنا چاہیں تو کرلیں لیکن میں جو آپ کو بتانا چاہ رہا ہوں آپ اس پر غور کیجئے۔اب یہاں سے شمولیت شروع ہوتی ہے۔اس سے ہمیں یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ مسئلہ کی نشان دہی خود سے نہ کی جائے بلکہ جو لوگ اس کا شکار ہیں وہ خود اس کی نشان دہی کریں اور یہی مناسب ہے۔

عارف صاحب نے ترقیاتی منصوبہ میں تخمینہ کا بھی بتایا کہ اگر سرکار کوئی کام کر رہی ہے تو شاید 10 روپے خرچ ہونگے وہی کام اگر ورلڈ بنک کر رہا ہے تو 35 روپے خرچ ہونگے اور اگر بہت بڑا منصوبہ ہے تو پتا نہیں کہ یہ لاگت کہاں تک جائے گی ۔ دوسری بات کہ اگر مسئلہ کی نشاندہی غلط ہو تو پھر مسئلہ وہیں رہ جاتا ہے ۔مثال کے طور پر ماری پور کی گلیوں میں سیوریج بہہ رہا ہے اور وہاں ٹریٹمنٹ پلان بنا دیا جو آج تک چلا ہی نہیں اور اس پر پتا نہیں کتنے ارب روپے خرچ ہو گئے۔کراچی دنیا کا واحد شہر ہے جس کا 95 فیصد پانی سمندر میں براہ راست جا رہا ہے۔کراچی میں ڈھائی ٹریٹمنٹ پلانٹ ہیں اس میں سے شاید آدھا چل رہا ہوگا تو پہلی چیز یہی ہے کہ مسئلہ ہے کیا۔ دوسری بات کہ مسئلہ کے اسٹیک ہولڈر کون ہیں ۔تیسری چیز کہ اس کا ڈیزائن کیا ہو یعنی مسئلہ حل کرنے کی ترتیب کیا ہو۔ اس ترتیب میں تکنیکی ماہر آجاتے ہیں ۔جیسا کہ عارف صاحب ہیں ۔ پروین رحمان ہیں ۔اس میں مسئلہ کی نوعیت کے مطابق ہی آرکیٹیکٹ، پلانر ،سوشل ورکر اور دیگر آجاتے ہیں ۔ان سے باہمی

طور پر مشورہ کیا گیا کہ اس مسئلہ کا حل کیا ہے ۔اس کا ڈیزائن کیسے ہو ۔اس کا تخمینہ کیا ہو ۔ایک تو ہو گئی تکنیکی شراکت ، دوسرا اس کا بجٹ یا تخمینہ ۔جب آپ نے یہ سوال سامنے رکھا کہ سیوریج کا نظام بہتر بنانے میں جب لائنیں ڈلیں گی ۔مین ہول بنیں گے تو اس میں لوگ خود کیا کریں گے ۔اس میں این جی اوز کیا کر سکتی ہیں کوئی معاون ادارہ (support organization) کیا کر سکتا ہے ۔گورنمنٹ کیا کر سکتی ہے ۔اب اس تفصیل میں نہیں جا رہا ۔سینی ٹیشن کے پانچ مدارج ہوتے ہیں ۔ٹوائلٹ گھر سے شروع ہوتا ہے ۔باہر گلی میں آتا ہے ۔اسی طرح ہمسایوں کا بھی ہوتا ہے اور پھر آخر میں ٹریٹمنٹ پلان ہوتا ہے ۔آخری اور پانچویں چیز تو بالکل غائب ہے ۔ drainage system میں یہ سب چیزیں آپس میں نہیں ملتی ہیں اور پھر یہیں سے مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے مثال کے طور پر گجر نالہ کا مسئلہ چل رہا ہے ۔انہوں نے اپنے طور پر تو کر لیا لیکن یہ وہاں سے آگے نہیں بڑھ رہا ہے اور جب آپ خود لوگوں کو یہ بتاتے ہیں کہ یہ 600 روپے میں بھی بن سکتا ہے ۔تو یہ رقم ان کے لیے قابل برداشت ہے اسی لیے وہ بنا لیتے ہیں ۔میری معلومات کے مطابق پورے اورنگی میں ایک لاکھ گھروں میں سینی ٹیشن کا یہ نظام موجود ہے ۔لوگ کہتے ہین کہ صاحب اورنگی میں یہ کام ہو گیا ۔وہ ایک جزیرہ بن گیا ۔ایسا نہیں ہے پورے پاکستان سے لوگ آتے گئے دیکھتے گئے ۔لوکل باڈیز کے لوگ آئے ، این جی اوز سے لوگ آئے ۔انہیں ٹریننگ دی گئی ۔انہیں بھی دورانِ تربیت یہی بات کہی گئی کہ آپ نے یہ کام خود کرنا ہے اب چاہے وہ لودھراں ہو یا بالاکوٹ کا علاقہ ہو ان کی مکمل تربیتی رہنمائی کی گئی ۔

انہیں منظم کیا گیا جس کے بعد لوگوں نے اپنا اپنا کام شروع کیا ۔اب اس کو آگے لیکر چلنے والی بات ہے ۔ان کی رہنمائی میں یہ کام ہو گیا جس کی تفصیل عارف صاحب نے بتا دی ۔اب اسے آگے بڑھاتے ہوئے پالیسی کا حصہ کیسے بنائیں ۔ 2006 میں پاکستان گورنمنٹ سینی ٹیشن پالیسی بنا رہی تھی ۔اس میں او پی پی نے اس کا پورا ڈرافٹ بنایا ، ڈیزائن بنایا اس وقت عارف صاحب اور میں بھی

اس کمیٹی کا حصہ تھے جو سینی ٹیشن کی پالیسی بنا رہی تھی ۔میرے ہونے کا فائدہ یہ تھا کہ میرے بہت سارے دوست بیوروکریٹ ہیں بہت سارے اچھے بھی ہیں اور کچھ برے بھی ہیں ۔انہوں نے کہا کہ ہمیں اسٹیرنگ کمیٹی میں ڈال دیں ۔ہم نے ڈال دیا۔عارف صاحب نے جو ڈرافٹ بنایا اور وہ شروع بھی ہوگیا۔ پورے پاکستان کی ایک سینی ٹیشن پالیسی بنی ہوئی ہے جس کی بنیاد یہی ہے کہ کچھ کام لوگ خود کریں گے یعنی انٹرنل کام لوگ خود کریں گے اور ایکسٹرنل کام حکومت کرے گی ۔اس طرح شمولیت کو فارمولائز کردیا گیا۔اب وہ عمل نہ کریں تو اور بات ہے ۔اسی طرح او پی پی نے بہت چیزوں پر تحقیق کی چاہے وہ رورل واٹر سپلائی ہو ۔رورل واٹر سپلائی کا یک ہی ماڈل تو نہیں ہوتا ۔ایک ٹینک بنا دیتے ہیں ۔ایشین بنک کا لون آیا۔ممبر قومی وصوبائی اسمبلی نے گھر بیٹھے لوکیشن کی شناخت کردی ۔اس کے بعد وہ بننا شروع ہوا ۔انجینیئر نے چالیس پچاس لاکھ کا پمپنگ اسٹیشن بنا کر حکومت کے حوالے کردیا لیکن اب اسے کوئی سنبھالنے والا نہیں ہے ۔کوئی ذمہ دار نہیں ہے ۔میں اتفاقاً پبلک سیفٹی ہیلتھ انجینئرنگ بھی ہوگیا۔اگلے تین دن بعد ایشین بنک کی جانب سے کنسلٹنٹ صاحب آگئے جن کے آنے کا مقصد انہوں نے یہی بتایا کہ مزید واٹر سپلائی کی اسکیمیں بننی ہیں ۔یہ میں نے خود دیکھا ہے کہ 900 اسکیمیں غیر فعال پڑی ہوئی ہیں ۔یہ میں نے انہیں بتا دیا۔کیونکہ پبلک ہیلتھ انجینئرنگ کے چیف انجینئر بڑے ایمان دار آدمی تھے ۔وہ پیسہ بھی لگاتے تھے ۔ان کا کام اسکیمیں بنانا تھا وہ بنا کر چلے گئے ۔اس کام کو لوکل باڈی سے نہیں جوڑا گیا۔ 900 اسکیمیں ویسی ہی فالتو پڑی ہوئی ہیں اسی لیے میں نے ان سے معذرت کرلی کہ اس کی ضرورت نہیں ہے ۔اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ڈیولپمنٹ ہمارے یہاں کیسے ہوتی ہے ۔

اب میں دوسری طرف آتا ہوں کہ میں ڈاکٹر اختر حمید سے کیسے ملا ۔تو وجہ یہ تھی کہ گورنمنٹ ہر 6 ماہ بعد مجھے OSD (Officer on Special Duty) بنا دیتی تھی ۔میں جب کوئی کام شروع کرتا تو وہ کہتے کہ آپ صحیح کام نہیں کررہے ۔مثال کے طور پر حیدرآباد میں خدا کی بستی بنائی تو

وہاں سندھی نیشنلسٹ لابی نے یہ کہا کہ میں بہاریوں کو بسار ہا ہوں اور یہ جام شورو یونیورسٹی کی جگہ پر قبضہ کرنے کی ترکیب ہے ۔مجھے وہاں سے نکال دیا گیا اس کے بعد میں سندھ گورنمنٹ میں آ گیا وہاں میں نے ابھی تھوڑا بہت کام کیا تھا کہ ایم کیو ایم نے مجھے OSD بنا دیا اس بار الزام یہ لگا کہ یہ کچی آبادی کو فروغ دینے کے لیے کام کر رہے ہیں ۔اب میں نے سوچا کہ کیا کروں اس سے قبل اختر حمید صاحب کے ساتھ میری رسمی سی ملاقات رہی ۔میں ان کے پاس آ گیا انہوں نے کہا کہ بھئی یہاں آجاؤ ۔ہم الٹے لٹکے ہوئے ہیں درختوں کے ساتھ تم بھی ایک چمگادڑ بن جاؤ ۔میں نے فوراً حامی بھر لی ۔کوئی 18 مہینہ میں ان کے ساتھ بیٹھا رہا ۔انہیں دیکھتا رہا سنتا رہا ۔اسی دوران کچھ عجیب قسم کے کام بھی ہو گئے جیسا کہ علی گڑھ میں فساد ہوا تو وہاں ان کی آباد کاری کا بھی کام ہونا ہے ۔بلوچ مہاجر آپس میں لڑ رہے ہیں ۔کبھی پٹھان اور مہاجر آپس میں لڑ رہے ہیں جہاں ان کا کاروبار بھی ختم ہوا ۔گھر بھی ختم ہوا ۔ان کا سروے کرنا یا پھر ان کی بحالی کرنا ۔اس طرح کے کام یا پھر حکومتَ سندھ کے کوئی کام ہو جاتے تھے ۔پھر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ نے دیکھ تو لیا ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں ۔اب آپ سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے ڈائرکٹر جنرل بن جائیں ۔میں نے جواب میں کہا کہ یہ تو میرے ہاتھ میں نہیں ہے تو کہنے لگے کہ نہیں آپ کوشش تو کریں ان دنوں ایشین بنک کا پروجیکٹ Rehalibition of Katchi Abadi in Orangi شروع ہوا تھا لیکن چل نہیں رہا تھا ۔انہوں نے کہا کہ ہم اس کے کنسلٹنٹ ہیں لیکن کام ہی نہیں ہو رہا میں نے کہا کہ چلیں پھر کوشش کر لیتے ہیں ۔میں وہاں کچی آبادی کے دفتر گیا تو میرے ایک دوست چیف ڈائریکٹر تھے انہوں نے بھی حیرت سے کہا کہ کچی آبادی میں جانا چاہتے ہو! یہ تو لوئر گریڈ کی پوسٹ ہے اور آپ تو سینئیر ہیں ۔میں نے کہا کہ نہیں آپ مجھے یہیں لگا دیں ۔میں نے وہاں کام شروع کر دیا اور جو اختر حمید صاحب کی تکنیک تھیں اسے نافذ کرنا شروع کیا ۔یعنی کہ کچی آبادی میں کام کیسے ہو رہا ہے ۔یہ لوگ کیا چاہتے ہیں ۔لوگ کس طرح اپنے مسائل کا حل

چاہتے ہیں۔لوگ کس طرح رہ رہے ہیں ۔ان کے وسائل کیا ہے ان سب کو ہم نے جمع کر کے باقاعدہ کام شروع کر دیا۔یعنی ایک پروگرام کے تحت اسے ریگولائز کرنا شروع کر دیا۔ساتھ ہی اسے decentralise کر کے simplify کر دیا۔خود انحصاری میں تبدیل کر دیا۔ڈاکٹر صاحب کا یہی نعرہ تھا کہ کسی سے مدد نہیں لینی ہے۔ورلڈ بنک،ایشین بنک حتیٰ کہ سندھ گورنمنٹ سے بھی مدد نہیں لینی ہے۔ویسے بھی کچی آبادی ایک اتھارٹی ہے اور اتھارٹی کا مطلب ہے کہ آپ نے کسی سے بھی مدد نہیں لینی ہے خود اپنے وسائل پیدا کریں لیکن وہاں تو کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا ہم نے اسے 6 ماہ میں خود انحصاری کی طرف مائل کر دیا اور سندھ گورنمنٹ کو ایک سمری بھیجی کہ آئندہ سے سندھ کچی آبادی اتھارٹی کو کوئی بجٹ نہ دیا جائے۔اس کے بعد سے ریگولائزیشن کا کام تو شروع ہوگیا لیکن اب انفرااسٹرکچر میں بہتری کیسے ہو۔ہم بتا رہے ہیں کہ ترقیاتی کام کا جو تخمینہ ہوتا ہے وہ ہم نے کر کے دکھایا کہ اگر کچی آبادی اپنے انجینئر کے ذریعہ یہ کام کرا سکتی ہے تو اس کا تخمینہ یہ ہوسکتا ہے۔ہمارے یہاں کے جو انجینئر تھے انہوں نے بہت مزاحمت کی کہ ایسا کیسے ہوگا ہم نے کہا کہ ہمیشہ ہی ایسا ہوتا آیا ہے جو انگریزوں کے زمانے میں بھی رائج تھا جسے ڈیپارٹمنٹل کہا جاتا تھا ایک contractual بھی ہوتا ہے۔ڈیپارٹمنٹل کام میں یہ ہوتا ہے کہ آپ ڈیزائن بنائیں ۔سامان خریدیں اور جو اس کی لاگت ہے وہ ہم سے لیں۔جتنی کچی آبادیوں میں ہم نے کام کیا۔ان سے پیسے لیے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا یعنی جگہ،ڈیولپمنٹ اور انفرااسٹرکچر۔اس سے ہم نے بڑے بڑے نالوں پر کام کیا جس کی مثال سبزی منڈی کے ساتھ ویلفیر کالونی ہے۔ وہاں کے لوگوں سے پوچھا کہ اصل مسئلہ کیا ہے وہ اس نالہ سے پریشان تھے۔عارف صاحب نے اسے بنوا دیا۔آج 30 سال ہوگئے ہیں نالہ ٹھیک چل رہا ہے۔وہ نالہ ڈھکا ہوا ہے جہاں لوگ ستانے کے لیے بیٹھتے ہیں۔ہمیں انجینئرنگ کا ڈیزائن تبدیل کرنے کی ضرورت ہے ہر ناکامی کی وجہ پیسہ کی کمی نہیں ہے۔پیسہ جہاں بھی جا رہا ہے وہاں غلط ہی استعمال ہو رہا ہے جیسا کہ

کہیں چوری ہے کہیں ڈیولپمنٹ کے نام پر غلط استعمال ہو رہا ہے تو کہیں دگنا چوگنا استعمال ہو رہا ہے ۔میں OSD بننے کے باوجود 10 سال کچی آبادی اتھارٹی میں رہا۔ یہ جو ڈاکٹر اختر حمید خان کا ماڈل تھا اس پر لوگ یہی تنقید کرتے تھے کہ یہ تو چل ہی نہیں سکتا خاص کر سرکاری اداروں میں یہ تو بالکل ہی نہیں چل سکتا۔ ہم نے ثابت کر دکھایا کہ گورنمنٹ میں بھی چل سکتا ہے بعد میں جو کچھ ہوا وہ الگ چیز ہے ۔لیکن یہ جو سوچ اور طریقہ کار ہے ۔ڈاکٹر اختر حمید خان نے جو طریقہ کار بتایا اور جن پہلوؤں کی نشان دہی کی ۔انہی پہلوؤں کو مدنظر رکھا جائے ۔میں یہاں ہاؤسنگ میں خدا کی بستی منصوبے کی مثال دوں گا کہ ہم نے ڈاکٹر صاحب کے فلسفہ کو ہی سامنے رکھا کہ لوگوں کا بنیادی مسئلہ کیا ہے وہ اس میں کیا کر سکتے ہیں ۔خود اپنی جیب سے کتنا پیسہ خرچ کر سکتے ہیں ۔ وزیر اعظم صاحب جو پانچ لاکھ گھر بنانا چاہ رہے ہیں آج بھی اتنی زیادہ سبسڈی اور قرض کی سہولت کے باجود دو ڈھائی سال کی مدت گزرنے پر بھی ایک گھر کسی ایسے فرد کو نہیں ملا جس کی آمدنی تیس چالیس ہزار ہو اور اگر خدا کی بستی میں جا کر دیکھیں تو وہاں وہ لوگ رہ رہے ہیں جن کی آمدنی بیس پچیس ہزار ہے اور وہ لوگوں نے خود بنائے ہیں ۔

کوئی بھی شعبہ ہو چاہے وہ سینیٹیشن ہو، ہاؤسنگ ہو، واٹر سپلائی ہو ۔ان تمام میں ڈاکٹر صاحب کے مروج کردہ اصولوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے ۔زراعت کے شعبہ میں بھی ڈاکٹر صاحب انقلاب لائے تھے اس وقت وہ بنگلہ دیش میں تھے ۔اس وقت انہوں نے ایجوکیشن کو آپریٹو اور سیونگ کہاں تک نام لیے جائیں ۔جیسا کہ یہ ہمارے مسائل ہیں ۔جیسا کہ ہمارے اکنامکس کے دوستو نے کہا کہ ہم ہر وقت معیشت کی ہی باتیں کرتے رہتے تھے ۔مائکرو کی بات ہی نہیں کرتے تھے کہ مائیکرو لیول پر کیا ہو رہا۔جس کی مثال شعیب سلطان صاحب یہاں بیٹھے ہوئے ہیں کہ SRSO میں اب 18 سال ہو گئے ہیں ۔اس عرصہ میں کتنی خواتین کو ، کتنے بچوں کو کتنے خاندان کو مختلف پروگرام سے جوڑا ہے ۔انہیں سپورٹ کی ہے اور اب وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہیں ۔طریقہ کار

تبدیل ہوجائے تو بہت کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے ۔مجھے خود اندازہ نہیں کہ میں نے کتنا وقت لے لیا ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ ڈاکٹر صاحب پر بات کرنے کے لیے وقت کی قید بہت مشکل ہے ۔

فضل نور: بہت شکریہ تسنیم صاحب ! آپ نے ڈاکٹر صاحب سے متعلق بہت عمدہ یاد داشت پیش کیں ۔ اب ہمارے اگلے ساتھی مصطفیٰ بلوچ ہیں ۔ یہ خود سول سوسائٹی اور کمیونٹی آرگنائزیشن پر خاصی ماہرانہ نظر رکھتے ہیں جہاں SPO s کے ساتھ ان کا 25 سالہ تجربہ ہے ۔ یہ پورے پاکستان میں گھومے ہیں ۔سٹیزن کمیونٹی بورڈ بھی انہوں نے ہی بنایا ہے ۔میں ان سے درخواست کروں گا کہ اربن کمیونٹی اور راربن پالیسی کو بیان کریں جیسا کہ عارف حسن صاحب نے بھی بنایا ہے ۔او را و پی پی کا ایک جز بھی ہے اس سے کمیونٹی کا بھی ایک حصہ شیئر ہو جاتا ہے ۔

مصطفی بلوچ: آپ سب دوستوں کا شکر گزار ہوں ۔ بنیادی طور پر جب میں ضلع کاونسل کراچی میں کام کرتا تھا تو اس وقت حفیظ آرائیں سے ہماری دوستی ہوگئی تو حفیظ آرائیں ایک دن مجھے ڈاکٹر اختر حمید خان صاحب کے پاس لے گئے ۔ڈاکٹر صاحب کے پاس چندلوگ بیٹھے ہوئے تھے اور گفتگو چل رہی تھی ۔ ہم لوگ بھی پیچھے جا کر بیٹھ گئے ۔گفتگو اچھی لگی تو جب ڈاکٹر صاحب فارغ ہو گئے تو میں نے ان سے ملاقات کی ۔ کچھ بات کی اور کچھ مسائل اٹھائے تو ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے پہلا سوال کیا کہ کراچی کو کتنا جانتے ہو ۔میں نے کہا کراچی کو بہت پرانا جانتا ہوں پیدا یہیں ہوا ہوں تو انہوں نے مجھے مثال دینے کو کہا تو میں نے جواب دیا کہ کراچی کے گھروں میں بادام، املی جسے ہم جنگلی املی کہتے ہیں اور ربادام ، برگد کے درخت پائے جاتے تھے ۔ان کو بھی جانتا ہوں ۔پھر کہنے لگے اورنگی کو جانتے ہومیں نے کہا سرا اتنا جانتا ہو کہ اورنگی بنیادی طور پر لاسی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے اور ران گن جیسے مطلب یہاں کوئی ندی بہتی تھی جہاں سے گزرگاہ ہوتی تھی جس کو لاسی زبان میں اورانگن کہتے ہیں تو یہ اورنگی ہوگئی کہتے ہیں اچھا تو اس طرح پوچھتے رہے کہتے ہیں کہ اب آپ بتائیں کہ آپ کو کیا مسائل ہیں میں نے کہا میرا ایک سادہ سا مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ ہم جہاں

رہتے ہیں تو اس طرف اور سامنے آبادی کے درمیان ایک ملیر ندی ہے ملیر ندی کے اُس طرف جو شہر ہے وہاں اچھی سہولیات ہیں ۔تعلیم ہے ۔ یونیورسٹیز ہے اور جو ندی کے اِس طرف رہتے ہیں وہاں اتنی سہولیات نہیں ہیں ۔اندھیرا ہے ۔تعلیم نہیں ہے اور کراچی یونیورسٹی سے جب طلباء کو واپس چھوڑنے کے لیے پوائنٹس نکلتے ہیں تو کراچی یونیورسٹی سے نکلنے والے پوائنٹس پر مختلف علاقے لکھے ہوتے ہیں جس میں ناظم آباد، فیڈرل بی ایریا، صدر وغیرہ لکھا ہوتا ہے لیکن کسی بھی پوائنٹس پر میمن گوٹھ نہیں لکھا ہوتا ابراہیم حیدری نہیں لکھا ہوتا تو یہ کچھ چھبتی ہوئی بات لگتی ہے کہ آخر ہم بھی اسی کراچی میں رہ رہیں ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہم اتنے محروم ہیں انہوں نے کہا کہ آپ نے اپنے سوال کا جواب خود ہی دیدیا ہے کہ ندی کے جو اس طرف رہتے ہیں ان کی ماں پڑھی لکھی ہے اور ابھی تک آپ کی بیٹی نہیں پڑھتی ۔یہی بڑا فرق ہے اس کو مٹاؤ تو بہت ساری آسانیاں ہو جائیں گی ۔مجھے ان کی بات سمجھ آ گئی اور پھر میں نے کمیونٹی میں جاکے بات کی کہ ہمیں اپنی بچیوں کو پڑھانے کی ضرورت ہے ۔
اس وقت آغا خان ہیلتھ سائنس نے ہمارے گوٹھ کا ایک سروے کیا تھا ۔انہی کے توسط سے ہمیں پتا چلا تھا کہ ہمارا شرحِ خواندگی خواتین میں 12 فیصد اور مرد حضرات میں 32 فیصد ہے ۔لیکن ان 12 فیصد میں کوئی میٹرک نہیں ہے بس صرف "خواندہ" ہیں جبکہ 32 فیصد میں سب میٹرک، بی اے یا ایم اے ہیں ۔اس حوالے سے پھر ہم ڈاکٹر صاحب کے پاس گئے اور انہیں یہ ساری صورت حال بتائی کہ یہ شرحِ خواندگی ہے لیکن اس کے باوجود یہ بڑا مسئلہ ہے انہوں نے ہمیں اسی پر کام کرنے کے لیے کہا کہ کمیونٹی کو کٹھا کرواو رلوگوں سے بات کرو اور جب یہ بات آگے بڑھ جائے تو مجھے آکر بتا دینا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ تعلیم پر بات کرنا نسبتاً آسان ہے کیونکہ جب سینی ٹیشن پر بات کرو تو مشکل کام لگتا ہے ۔اس بات سے ہمیں حوصلہ ملا ۔ہم نے جا کر کہ لوگوں کو کٹھا کیا ۔بات شروع کی ۔ہر گھر سے 25 روپے چندہ لیا جو ہمارے گوٹھ میں میکھو ار رہتے تھے ۔ان سے بھی بات ہوئی وہ گھر بناتے تھے انہوں نے کہا ہم ہفتہ بھر کام کریں گے تو چار دن کی مزدوری آپ سے لینگے

لیکن تین دن کی مزدوری نہیں لینگے کیونکہ ہماری بچیاں بھی یہاں پڑھیں گی اوراس کے ساتھ ساتھ ہم نے زمیندار سے زمین کا ٹکڑا بھی لے لیا اوا یجوکیشن پر کام شروع کیا اب مسئلہ اساتذہ کا تھا کہ گرلز ٹیچر نہیں تھی۔اتفاق سے وہاں ڈاکٹر غفار بلو کا ایک سینٹر تھا جو ماں اور بچہ کی صحت پر کام کرتا تھا۔ ان کے پاس یونیسیف کی گاڑی بھی تھی۔ہم نے اس سینٹر پر جا کر درخواست کی کہ ہمیں خاتون ٹیچر کو کھوکھراپار سے سعود آباد سے لانے جانے کے لیے گاڑی دے دیا کریں ۔انہوں نے ہماری درخواست منظور کی اور پڑھنے لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ایک دن میں ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا اور انہیں خوشی خوشی بتایا کہ تعلیم پر کام شروع ہوگیا ہے اور ہماری تعلیم بہت آگے جارہی ہے اس وقت ہمارے گوٹھ کی خواتین کی شرحِ خواندگی 83 فیصد ہے اور مرد حضرات کا 62 فیصد ہے۔صرف اتنا نہیں ہے بلکہ اس سے قبل کوئی خاتون بھی میٹرک پاس نہ تھیں اور اب ہمارے گاؤں میں چار ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں۔ہمیں یہ بھی اعزاز رہا ہے کہ ابھی تک ملیر سے کوئی مرد بھی سی ایس ایس نہیں کر پایا ہے البتہ ہمارے یہاں سے خاتون سی ایس ایس میں کامیابی حاصل کر چکی ہیں۔تو جب یہ کامیابیاں حاصل ہوئی تو میں پھر ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب بڑا اچھا کام جارہا ہے اچھی کاوشیں ہو رہی ہیں تو انہوں نے مجھے رمضان نامی بندے سے ملوادیا۔جس کے بعد انور راشد صاحب سے بات ہوئی پروین رحمان صاحبہ سے بات ہوئی ۔اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔

میں جب بھی فارغ ہوتا او پی پی چلا جاتا تھا تو ایسے ہی ایک دن دیکھا کہ کوئی وفد آیا ہوا ہے اور ڈاکٹر صاحب ان سے غربت پر بات کر رہے ہیں۔ مجھے یہ باتیں بڑی اچھی لگ رہی تھیں۔ پھر میں بھی دیکھا دیکھی اپنے گوٹھ سے ایک وفد لیکر ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچ گیا اور کہا کہ ”اڈاکٹر صاحب وہ جو آپ باتیں کر رہے تھے آپ ان سے بھی کریں کہ غربت کیسے کم ہوگی۔کیا ہوگا“ لیکن جواب میں ڈاکٹر صاحب نے بات ہی کچھ اور کردی جو بات میں نے کہی تھی وہ کچھ اور تھی ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ” آپ درگاہوں پر جاتے ہیں“ انہوں نے کہا” جی“ ۔ڈاکٹر صاحب نے

پوچھا" لنگر ملتا ہے" کہتا ہے" ہاں لنگر کھاتے ہیں" کہتے ہیں" لنگر آپ کی مرضی سے ملتا ہے" تو وہ کہنے لگے کہ" نہیں، مرضی کا تو نہیں ہوتا" ۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ" آپ کہیں میں مرغی نہیں کھاتا ہوں مجھے یہ دیدیں" کہتا ہے کہ یہ نہیں چلتا۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ" لنگر کے پیچھے آپ دھکے کھاتے ہیں" ۔جس دن آپ کو یہ بات سمجھ آجائے گی اس دن غربت بھی سمجھ آجائے گی۔اور پھر مجھے کہا کہ آپ ایسا کریں جا کر غربت کو تلاش کریں ڈھونڈیں ۔اسی دوران مجھے SPOS میں نوکری ملی۔ میں گھوٹکی چلا گیا تھا وہاں ایک جگہ بحث ہو رہی تھی جس میں سارے لوگ غریب ہی تھے میں نے ان سے پوچھا کہ جی آپ بتائیں کہ آپ غریب کیوں ہیں مجھے یہی توقع تھی کہ لوگ کہیں گے کہ جی اللہ تعالی کی مرضی ۔نصیب کی بات ہے ۔لیکن کسی سے بھی ایسا نہ کہا صرف ایک بندے نے جواب دیا کہ میں غریب اس لیے ہوں کہ میں مہر ہوں ۔ہمیں حیرت ہوئی کہ مہر وہاں برادری ہے میں نے کہا کہ بھائی مہر سردار محمد غلام بھی ہیں سردار علی گوہر بھی ہے اس کے پاس تو لاکھوں کی زمینیں ہیں انکی تو کروڑوں کی جائیدادیں ہیں ان کے گھوٹکی کے صحرا میں جو بنگلے ہیں اسے دیکھ کر تو عربوں کے بھی پسینے چھوٹ جاتے ہیں تو آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ مہر ہونے کی وجہ سے غریب ہیں ۔انہوں نے کہا کہ ان کے پاس تو ہوگی لیکن میں مہر ہونے کی وجہ سے غریب ہوں ۔پھر اس نے وضاحت کی کہ اگر شکارپور میں مہر اور جتوئی کا جھگڑا ہوتا ہے تو میں اپنی زمینوں پر نہیں جاسکتا کہ وہ مجھے مارینگے اب میرا قصور کیا ہے نہ میں مارنے والے کو جانتا ہوں نہ میں مرنے والے کو جانتا ہوں ۔میرا قصور یہ ہے کہ میں مہر ہوں وہ اپنے اپنے بندوں کا نقصان پورے کرینگے ۔ ایک بات تو یہ ہے ۔دوسری بات یہ کہ جب صلح صفائی ہوجاتی ہے تو ہمارے سردار کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ہم زیادہ مریں ۔کیونکہ جب ہم مرنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے تو ہمارا سردار کہتا ہے کہ مجھے کوئی شرم نہیں آئے گی اگر میں پیسے دے کر اٹھوں ۔مجھے اس وقت شرم آئے گی جب میں پیسے لے کر اٹھوں ۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جب قبیلے ایک دوسرے کے لوگ مارتے ہیں تو جس نے

زیادہ مارے ہوتے ہیں اس پر جرگہ کی طرف سے جرمانہ عائد ہو جاتا ہے۔

تیسری بات اس نے یہ بتائی کہ ہمارے یہاں ایک ونگار اور ایک بیگار ہوتی ہے ۔ونگار یہ ہوتی ہے کہ ہم کسان آپس میں مل کر ایک دوسرے کا کام کرتے ہیں جب سوئنگ ہوتی ہے تو سب ایک ہی جگہ آتے ہیں اور پھر دوسرے دن دوسری زمین پر جا کر swing کر کام کرتے ہیں۔ لیکن کھارون کے پاس جاتے ہیں تو وہاں بیگار ہوتی ہے وہاں ونگار نہیں ہوتی۔ہم کھارون کے ساتھ ان کے منشی کی،ان کے کم داروں کی اور ان کے جاننے والے پولیس افسر کی بھی بیگار کرتے ہیں۔اور یہ سب مہر غریب ہونے کی وجہ سے ہے۔اور یہی ہمارا قصور ہے۔مجھے واقعی یہ بات عجیب لگی۔تب مجھے پتا چلا کہ ان قبائلی جھگڑوں میں غربت کہاں کہاں پستی ہے۔اس کے بعد میں نے SPOs میں قبائی جھگڑوں کو ڈاکیومینٹ کرنا شروع کیا۔ان کی بنیادوں پر غربت کہاں پلتی ہے اس کے بعد میں ایس-پی-او میں بیس جھگڑے ہیں ان کو میں نے Document کرنا شروع کیا اور دیکھا کہ واقعی غربت کہاں پر ہے۔ایک بندے نے کہا کہ میں اپنی بیوی کہ وجہ سے غریب ہوں تو میں نے کہا کہ بیوی بیچاری کا کیا قصور ہے اس نے کہا کہ صاحب میں غریب آدمی ہوں میرے پاس زمین نہیں ہے صرف دو بکریاں ہیں جب بکری دو بچے دیتی ہے تو میری بیوی ایک بچہ پیر صاحب کو دے آتی ہے۔اب پیر صاحب کے بکروں میں اضافہ ہو رہا ہے اور میرے کم ہوتے جا رہے ہیں۔میں نے وجہ پوچھی کہ وہ کیوں دیتی ہے تو کہنے لگا کہ میری بیوی اپنے والدین کی چھٹی اولاد تھی اس سے پہلے بھی پانچوں لڑکیاں ہی تھیں۔والدین اسے قتل کرنا چاہتے تھے تو پیر صاحب نے ہی اسے قتل کرنے کو منع کیا تھا۔اب بیوی مجھے کہتی ہے کہ میری زندگی ان پیر صاحب ہی کی دی ہوئی ہے کیونکہ اس کے بعد جو بھائی ہوا تھا وہ بیمار ہوتا تو بھائی کو ڈاکٹر صاحب کے پاس لے جاتے اور اسے انہی پیر صاحب سے دم کرواتے تھے۔تب مجھے سمجھ آیا کہ میں تو پیدا بھی پیر صاحب کی دعا سے ہوئی ہوں اور ٹھیک بھی ان کے دم سے ہوئی ہوں اسی لیے ایک بکرے

پر پیر صاحب کا حق تو ہے۔

مجھے غربت کے نام پر عجیب وغریب چیزیں نظر آرہی تھیں اور بنیادی طور پر تین رشتے ملیر کو کراچی کا گرین بیلٹ کہا جاتا تھا اور ڈملوٹی کے کنویں کراچی میں پانی کی سپلائی کے بڑے ذرائع تھے۔آج جب ہم ملیر کو دیکھتے ہیں تو ماضی کا خیال گزرتا ہے کہ یہ کتنا ہرا بھرا سرسبز شاداب ہوتا تھا۔ امرود،شریفے،آم اور کیلے کے کئی درخت ہوا کرتے تھے اس کے علاوہ بہت ساری سبزیاں بھی ہوتی تھیں۔کبھی ٹماٹر دس یا بیس روپے کلو ملتا تو ہم کہتے کہ چلو ملیر کے غریب کی قربانی کسی شہر کے غریب کے کام آئے گی۔اسے سستا ملے گا۔لیکن ایسا نہیں تھا وہ جو 10 روپے اس کو ملتے تھے۔ کراچی کا غریب وہی ٹماٹر 50 روپے کلو بیچتا تھا۔میں سمجھا کہ گاؤں کا غریب شہری غرب کو سپورٹ کرے گا لیکن ایسا نہیں تھا وہ جو درمیان کے مڈل مین تھے وہ تو چیزوں کو دوسری ہی طرح دیکھتے تھے۔پھر مجھے اور سمجھ آتی گئی۔میں نے یہ بات ڈاکٹر صاحب کو بتائی تو انہوں نے کہا کہ بالکل ٹھیک جارہے ہو اب تھوڑا اور آگے جاؤ۔

یہ آخری بات میں ڈاکٹر صاحب سے شیئر نہیں کر پایا کیونکہ وہ جا چکے تھے۔ابھی جو شعیب سلطان صاحب،عارف صاحب یا تسنیم صدیقی صاحب بتا رہے تھے کہ ڈاکٹر صاحب باہر کی فنڈنگ پسند نہیں کرتے تھے۔جو آئی ایم ایف کے پیسے آتے ہیں اور جو سبسڈی ختم کی جاتی ہے اور GDP مارکیٹ میں 6 ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ہمیں مارکیٹ میں ریٹ نہیں ملتے تو ہمیں اس وقت غربت کا احساس ہوتا ہے۔اس سے مجھے سمجھ آیا کہ بنیادی طور پر یہ 3 رشتے ہیں جن کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ایک پیداواری رشتہ زمیندار اور کسان کا ہے۔کسان محنت کرتا ہے وہی اصل مزدوری کرتا ہے لیکن سارے وسائل زمیندار کے پاس جاتے ہیں۔دنیا کا مجھے علم نہیں لیکن پاکستان میں یہی دیکھا ہے کہ سیاسی،سماجی،معاشی حتیٰ کہ مذہبی اقتدار بھی ان کے پاس ہوتا ہے جن کے پاس وسائل ہوتے ہیں۔کیونکہ یہاں وسائل زمیندار کے پاس ہوتے ہیں تو وہ یونین کونسل سے لیکر

سینٹ تک کی سیٹ جیت جاتا ہے اور غریب کی کوئی نمائندگی نہیں ہوتی۔

پھر اسمبلی میں جو قانون سازی ہوتی ہے اس کی مثال ہمارے یہاں پچھلی بار ہو چکی ہے جو صرف مفادات پر ہے۔اس سے ہی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔اب اس رشتہ میں جو بات چیت ہوتی ہے اسے بھی غور سے سمجھیں۔زمیندار سے پوچھیں کہ آپ کا کسان کیا کر رہا ہے۔زمیندار کہے گا کہ کچھ بھی نہیں کرتا۔نکما ہے۔کام چور ہے۔وہ آدمی جو صبح فجر کے وقت سے لگا ہوتا ہے اور مغرب تک کام کرتا ہے وہ بھلا کیسے کام چور ہوسکتا ہے۔پھر آپ یہی سوال کسی مرد سے پوچھیں کہ آپ کی بیوی کیا کرتی ہے وہ یہی جواب دے گا کہ کچھ نہیں کرتی۔نکمی ہے۔کام چور ہے۔جو الفاظ اس نے اوپر سے سنے ہیں انہی کو وہ اپنے سے کمزور والے پر دہراتا ہے اور پھر یہی بات امریکا لندن جیسی سپر پاور ہم جیسے غریب ملکوں کو کام چور،فضول خرچ سمجھتی ہے۔زبان وہی ہے جو نیچے سے ہوتی ہوئی آئی ہے۔سلطنت بھی اس سے محروم نہیں۔

مجھے یہ گٹھ جوڑ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ انکا آپس میں کیا رشتہ ہے انکا کیا تعلق ہے۔پچھلے ہفتے جو ملیر میں ناظم جوکھیو کا قتل ہوا اس میں مجھے گٹھ جوڑ سمجھ میں آیا کہ ان کا آپس میں کیا تعلق ہے۔اب میں یہ بات کھل کر بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ اتنا حساس معاملہ ہے۔

اب ملیر کی صورتِ حال مختلف ہے حالانکہ بارشیں بھی ہوئی ہیں۔ پانی بھی ہے لیکن کھیت اجڑ گئے ہیں۔اب ملیر میں امرود، کیلا نہیں ہے۔نہ ہی بیوپار ہیں اور نہ ہی وہاں پر ٹرک ہیں۔تاج حیدر صاحب! میں اگر دو چیزیں بیان کروں جو کمیونٹی موبلائزنگ میں سیکھی ہیں۔کیا ہے ملیر میں۔اس وقت ملیر میں امرود نہیں ہے۔کیلا آم نہیں ہے۔ان کے بیوپاری بھی نہیں ہیں۔وہ ٹرک جو بھری جاتی تھیں وہ بھی نہیں ہے۔البتہ لینڈ مافیا کے بروکر گھوم رہے ہیں کہ آپ زمین کب بیچو گے اور کسے بیچو گے۔پہلے ملیر میں بات چیت ہوتی تھی۔مجھے اندازہ ہے کہ میں خطرناک بات کر رہا ہوں جب بھٹو ازم تھا تو اس وقت مسائل پر گفتگو ہوتی تھی۔حقوق پر بات ہوتی تھی لیکن اب ٹپی ازم میں

پروپرٹی کی بات ہوتی ہے۔زمین پر قبضہ کرنے کی بات ہوتی ہے۔زمین بیچنے کی بات ہوتی ہے۔ ڈپٹی کمشنر آ کر کھلی کچہری کیا کرتے تھے کہتے تھے کہ بھائی یہ جو زمین ہے فلاں زمین کے سامنے ہے اگر کوئی دعویدار نہیں ہے تو وہ اس کو دے دیتے۔اس طرح زمین مل جاتی تھی لیکن اب ملیر میں لیز بالکل ختم کر دی گئی ہے۔

ہماری ریونیو کی زمین تھی وہ ملیر ڈیولپمنٹ اتھارٹی کو دے دی گئی تھی۔ریونیو میں چاہے کرپشن ہو اس کا تعلق کسان اور زمیندار سے ہے لیکن ملیر ڈیولپمنٹ اتھارٹی کا بلڈرز سے ہے۔ اب زمین بلڈرز کے پاس چلی گئی۔ 6 کراچی کی ویسٹ کی زمین کے ڈی اے کو دیدی گئی ہے۔اب تو ہاتھوں سے زمین نکلتی جارہی ہے۔جو اتنے زمین ہتھیانے والے آ گئے ہیں۔اب تو ہر چوتھا آدمی بروکر ہوتا ہے۔اس سے ہمیں یہی گٹھ جوڑ سمجھ آتا ہے کہ غریبوں کا استحصال کریں۔ کمائیں۔طاقت کا استعمال کریں۔زمین بیچ کر اگلے الیکشن کے لیے 5 ارب کمائیں۔ایک ارب کرپشن سے چھوٹنے کے لیے دیں۔ایک ارب الیکشن میں خرچ کریں اور باقی 3 ارب سے پراپرٹی بنائیں۔لیکن افسوس کہ ملیر اب اپنی پہنچان کھو رہا ہے۔ملیر جو کراچی کا سبزہ ہوا کرتا تھا اب کوئی بھی ملیر سے اس تصور کی توقع نہ رکھے نہ ہی اب وہ سبزیاں اگائے گا۔ملیر کے ڈملوٹی کے کنویں بھی خشک ہو گئے ہیں اور تیسرا ذریعہ حب ڈیم ہے اس کا بھی حال اچھا نہیں ہے۔

اب ڈاکٹر حمید خان تو ہیں ہی نہیں پھر ہمیں کون سوچ دلائے گا کہ کیسے اپنے لوگوں کو بچانا ہے۔یہ ان کے گٹھ جوڑ کا نتیجہ ہے کہ جب شکار روکنے پر غریب آدمی کا قتل ہوسکتا ہے تو پھر زمین تو کوئی چیز نہیں شکریہ۔

فضل نور: بہت شکریہ مصطفیٰ بلوچ صاحب! آپ نے بہت اچھے سے اپنی یادداشت کو جوڑا ہے۔میرے خیال میں جو رئیل اسٹیٹ کے پہلو ہیں جو ترقی کے لیے ہیں وہ بھی بین الاقوامی فنانسنگ کی طرح ایک بہت بڑا چیلنج ہیں۔کیونکہ یہ دنیا بھر میں ہے یہ صرف کراچی یا ملیر کے لیے

نہیں ہے تو واقعی آپ نے اسے nexcus کا درست نام دیا ہے کہ یہ گٹھ جوڑ ہی تو ہے۔ جب لیاری ایکسپریس وے بننا شروع ہوا تھا تو اس وقت سے ہم اس چیز کو زیادہ محسوس کر رہے ہیں۔اس چیز کو یونس بلوچ بحیثیت اربن ریسورس سینٹر کے ڈائریکٹر ہونے کے ناطے زیادہ اچھا سمجھ سکتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا اربن پروجیکٹ تھا جس کے نتیجہ میں بہت زیادہ بے دخلی ہوئی تھی۔اور اس کے بعد آپ نے خود دیکھا کہ لوگوں کو کہاں کہاں جگہ دی گئی اور کن لوگوں کو جگہ دی گئی۔یہ باتیں یونس صاحب سے ہی سنتے ہیں کہ وہ ان چیزوں کو کس طرح دیکھتے ہیں۔

یونس بلوچ: ڈاکٹر صاحب ہمارے استادوں کے استاد ہیں۔ان کی شخصیت اور ان کے کام کے اتنے پہلو ہیں کہ ان پر جتنی بات کی جائے اتنی ہی کم ہے۔آج صبح سے

کافی سینیئر لوگ بات کر چکے ہیں اور آخر میں مجھے بات کرنے کے لیے کہا ہے۔اتنے سینیئر لوگوں کے بعد بات کرنا بالکل عجیب لگتا ہے۔

پہلے میں ڈاکٹر صاحب کا کام بتا دوں۔جو مجھے سمجھ میں آیا اور جو کراچی میں انہوں نے کام شروع کیا تو وہ کافی چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا جیسے عارف صاحب بتا رہے تھے سب سے بڑا چیلنج یہ ہی تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو یہی سننے کو ملتا تھا کہ یہ نہیں ہوسکتا۔یہ ناممکن ہے۔لیکن ڈاکٹر صاحب نے وہ سارے خدشات، رکاوٹیں توڑ کر دکھائے۔رکاوٹیں کیا تھیں؟ ایک تو یہ تھی کہ لوگ اکھٹا نہیں ہو سکتے تھے۔اور دوسری سوچ میں رکاوٹ یہ تھی کہ لوگ اکھٹا ہو نگے لیکن اپنے مسائل اپنی مدد آپ سے حل نہیں کر سکتے تھے۔تیسرا جو سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ لوگوں کو ٹیکنیکل سپورٹ فراہم نہیں کی جاسکتی تھی مگر ڈاکٹر صاحب نے ممکن کر کے بتایا۔انہوں نے ٹیکنیکل لوگوں کی ایک ٹیکنیکل ٹیم بنا کر ٹیکنیکل ایکٹوسٹ کے ذریعہ لوگوں کو ٹیکنیکل سپورٹ فراہم کی۔اور کمیونٹی کی سطح پر یہ ٹیکنیکل سپورٹ فراہم کی جائے۔معلومات مہیا کی جائیں تو یہ عین ممکن ہے کہ محلہ کی سطح پر کئی مسائل اپنی مدد آپ کے تحت حل ہو سکتے ہیں۔انہوں نے یہ ثابت کر کے دکھایا کہ اگر اپنی مدد آپ کے تحت مسائل حل کیے جائیں تو

محلہ کے لوگوں کی پوزیشن تبدیل ہو جاتی ہے۔

ایک غلط سوچ یا مفروضہ یہ بھی تھا کہ عوام اور گورنمنٹ مل کر کام نہیں کر سکتے۔انہوں نے اپنے کام سے یہ ثابت کر دکھایا کہ کمیونٹی اور گورنمنٹ مل کر کام کر سکتے ہیں۔جس کے نتیجہ میں ان کی حالت اچھی ہو جاتی ہے۔جیسا کہ تسنیم صاحب نے سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے حوالہ سے بھی ذکر کیا۔جہاں کس قدر اپ گریڈیشن پر کام ہوتے تھے اور لوگ خود سے پیسے بھی دیتے تھے۔سندھ کچی آبادی اتھارٹی جو چلی ہے وہ اسی پر چلی ہے کہ لوگوں نے اپنے گھر لیز کرنے کے لیے پیسے دیئے جو سیلف فنانس کا تصور رہے۔میں نے 1991 سے اورنگی پائلٹ پروجیکٹ میں کام شروع کیا جہاں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کام کرنے کا اعزاز بھی ملا ہے۔وہ جب بھی ہمیں سمجھاتے تھے تو یہی کہتے تھے کہ لوگوں کے ساتھ کام کرنے کی کوشش کریں۔ان کے مسائل سمجھنے کی کوشش کریں۔ان کے مسائل کی نوعیت دیکھیں۔مسائل کی وجوہات سمجھیں اور پھر ترجیحات بھی دیکھیں کہ کیا ہو سکتی ہیں۔ یعنی فوری طور پر کون سے مسائل ہیں جنہیں حل کیا جائے تو لوگوں کو زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے۔دوسری بات کہ کمیونٹی کی مستقل پائیداری (Empowerment) کے لیے جو مختلف جارگن ہیں جو ڈونرز اور این جی اوز استعمال کرتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب نے وہ جارگن تو استعمال نہیں لیے لیکن انہوں نے یہ ضرور سمجھا دیا کہ اگر اس طرح سے کام کیا جائے تو community empowerment ہو سکتی ہے۔اور وہ گورنمنٹ کے برابر آ کر گورنمنٹ سے بات (negotiate) کر سکتی ہے۔یہ انہوں نے اپنے تیار کیے ہوئے ماڈل سے بتایا کہ لوگ اکٹھے بھی ہو سکتے ہیں، ان کے کام میں معاونت بھی کی جا سکتی ہے اور ٹیکنیکل سپورٹ بھی کی جا سکتی ہے۔اہم چیز بھی یہی ہے۔

جس طرح فضل ابھی کہہ رہے تھے کہ شہر میں توڑ پھوڑ ہو رہی ہے بڑے پیمانے پر بے دخلی کی جا رہی ہے۔کراچی کے ارد گرد جو گوٹھ ہیں بجائے انہیں بے دخل کرنے کے اگر انہیں ٹیکنیکل معاونت فراہم کی جائے تو اس سے ان کے حالات پر اچھا فرق پڑ سکتا ہے۔لیاری ایکسپریس وے

پر بہت بڑے پیمانے پر بے دخلی ہوئی ہے اس کو روکا تو نہیں جاسکا مگر جب لوگوں کو معلومات دی گئیں اور اس کی بنیاد پر دوبارہ آباد کیا گیا۔گورنمنٹ نے باقاعدہ طور پر انہیں دوبارہ آباد ہونے کا پلان بھی بنا کر دیا۔ابھی بھی گجر نالے پر بہت بڑے پیمانے پر انہیں بے دخل کیا گیا ہے ۔ وہاں لوگوں نے احتجاج بھی کیا ۔عدالت بھی گئے ۔عدالت نے گورنمنٹ کو تاکید کی ہے کہ انہیں دوبارہ آباد کریں ۔سندھ گورنمنٹ نے وعدہ بھی کیا ہے کہ ان کی آبادکاری کی جائے گی لیکن یہ بات بھی برحق ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر انہیں بے دخل کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی ۔گجر نالہ کے لیے بھی کورٹ کا آرڈر یہی تھا کہ تجاوزات ہٹائی جائیں مگر گورنمنٹ نے اس حکم کی آڑ میں بہت زیادہ لوگوں کو بےگھر کیا۔نالے کے علاوہ نالے کے اطراف میں دونوں طرف 30،30 فٹ کا روڈ بنانے کا فیصلہ بھی کیا ہے ۔یہ بات تو کورٹ کے حکم نامے میں شامل نہیں تھی ۔کورٹ کے آرڈر میں تو یہ بھی تھا کہ ان بےگھر لوگوں کو معاوضہ دیا جائے اور انہیں دوبارہ آباد کیا جائے ۔اس پر گورنمنٹ نے عمل نہ کیا اور مجھے نہیں لگتا کہ گورنمنٹ اس چیز پر عمل کرے گی ۔

یہ ساری چیزیں جو ہمارے سامنے روزانہ آرہی ہیں اس کا یہی مقصد ہے کہ کس طرح زمین generate کی جائے ۔کراچی سرکلر ریلوے کے اردگرد زمین نکالی جارہی ہے اس کے سوا کوئی مقصد نہیں ۔ابھی ہم نے کراچی سرکلر ریلوے کی جو EIA رپورٹ پڑھی ہے اس میں صاف لکھا ہے کہ کے سی آر کی جو زمین ہے اسے کمرشل مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے ۔گجر نالہ،اورنگی نالہ میں بے دخلی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کی گئی ہے ۔تاکہ اس کے نتیجہ میں زمین نکلے ۔روڈ نکالے جائیں ۔اس سے زمین کی قیمتوں میں اضافہ ہوگا۔وہاں کچھ لوگوں کو تو نکال کر پھینکا گیا باقی لوگ مجبوراًاپنی جگہ بیچ کر چلے جائیں گے جیسا کہ لیاری ایکسپریس وے میں ہوا کہ پہلے بہت سارے لوگوں کو بےگھر کیا گیا اور پھر باقی لوگ جو بچے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی زمین بلڈرز کو بیچ کر چلے گئے ۔

ڈاکٹر صاحب کا فلسفہ یہی ہے کہ اگر لوگوں کو ٹیکنیکی معاونت فراہم کی جائے انہیں معلومات فراہم کی

جائیں تو ان کی حالت اچھی ہو سکتی ہے۔ بدقسمتی یہی ہے کہ ہم بہت کم لوگوں کو ہی معلومات فراہم کر پاتے ہیں جو کسی مسئلہ سے درپیش ہیں۔ آج کا یہ پروگرام این ای ڈی کی طرف سے ایک بہت اچھا قدم ہے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ ہم ڈاکٹر صاحب سے حاصل کیے ہوئے سبق کو اگلی نسل میں منتقل کریں۔ ان نوجوانوں کو بتائیں۔ تاکہ وہ بھی اس سے سیکھیں اور اپنے طور پر آگے بڑھائیں۔ بہت شکریہ

فضل نور: بہت شکریہ یونس! اب ہم پروگرام کے اختتام کی طرف جا رہے ہیں۔ ہمارے پاس آج کے دو پینلسٹ کے وڈیو پیغامات ہیں جو آج اس سیشن میں براہ راست شریک نہ ہو سکے۔ میں درخواست کروں گا کہ سمیر اگل اور حافظ راشد کا پیغام یہاں سنا دیں۔

سمیر اگل (وڈیو پیغام): میں اربن ریسورس سینٹر کی شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے آج ڈاکٹر صاحب کے فورم میں شرکت کا موقع دیا۔ ہمارے لیے عارف حسن صاحب اور یو آر سی کے ساتھیوں کی خاص شفقت ہے کہ وہ ہمیں اس قابل سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی میں بہت سے کام کیے۔ بہت سے کامیاب پروجیکٹ کیے۔ جس پر ان کے دوسرے ساتھیوں نے بات کر لی ہے۔ میں ان کی زندگی کے آخری منصوبے یعنی او پی پی ماڈل کی بات کر رہی ہوں۔ بڑی کامیابی سے اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ 1990 کے آخر میں کراچی گئے۔ اس پروگرام کو دیکھا۔ او پی پی کے جو ساتھی تھے ان کے ساتھ وقت گزارا۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کئی نشستیں ہوئیں۔ ان کے ساتھ ہم نے بہت کچھ سیکھا اور پھر من و عن اپنے شہر یعنی راولپنڈی میں اس منصوبے پر کام کیا۔ ہم نے پنڈی کی کئی ہزار گلیوں میں اپنی مدد آپ کے تحت سیوریج کا کام کیا۔ نقشے بنائے۔ سینی ٹیشن اور دیگر چیزوں پر کام کیا۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ ہمارے کام کو دیکھنے بھی آئے تھے۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی۔ انہوں نے ہمارے کام کو نہ صرف دیکھا بلکہ اسے سراہا بھی۔ میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب کے کام کو جو ہم نے اپنایا اس کو اپنانے کی وجہ یہی تھی کہ کسی بھی کام کو اس کے بنیادی فلسفہ کے مطابق ہی اپنایا جائے تو وہ زیادہ

اچھے طریقے سے کامیاب ہوتی ہے اور یہی ڈاکٹر صاحب کا فلسفہ تھا۔

حافظ راشد (ویڈیو پیغام): ڈاکٹر اختر حمید صاحب کے ساتھ پہلی ملاقات اکتوبر 1998 میں لاہور میں پلاننگ اینڈ ڈیویلپمنٹ کے دفتر میں ہوئی تھی جہاں وہ اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کی طرز کا ماڈل پنجاب میں بنانے کی درخواست پر لائے تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں ہم ان کی سوچ اور فلسفہ سے بہت متاثر ہوئے تھے جو ان کے ادارے کے ساتھ وابستگی کا سبب بنا۔ اس کے بعد ہمارا او پی پی سے ایک رابطہ ممکن ہوا جہاں ہم مختلف تربیتی مواقع کے لیے جاتے رہے۔ افسوس کی بات کہ اس کے ٹھیک ایک سال کے بعد یعنی اکتوبر 1999 میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد جو ان کے شاگرد تھے، دوست تھے ہمارا تعلق ان کے ساتھ برقرار رہا۔ جس میں عارف حسن صاحب، تسنیم صدیقی صاحب، پروین رحمن صاحبہ، انور راشد صاحب ان لوگوں سے ہمارا مسلسل رابطہ رہا اور ہم ان سے سیکھتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب کا اپنی مدد آپ کا فلسفہ ہمارے لیے بہت متاثر کن تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب این جی اوز بہت زیادہ کام کر رہی تھیں۔ اس وقت یہ بات کہنا کہ مقامی لوگ اپنی مدد آپ کے تحت اپنے چھوٹے مسئلے حل کر سکتے ہیں یہ بھی بڑی بات تھی۔ میں چونکہ ڈائرکٹریٹ جنرل کچی آبادی پنجاب میں کام کرتا ہوں اسی لیے ان کا کام فلسفہ بہت اچھا لگا۔ اس چیز کو ہم نے سیکھتے ہوئے ڈائریکٹریٹ جنرل کچی آبادی پنجاب میں ڈاکٹر صاحب کی اسی سوچ کے مطابق پنجاب کی کچی آبادی کی پالیسی میں component sharing model جو ڈاکٹر اختر حمید خان صاحب کا او پی پی میں ایک خاص طریقہ کار تھا۔ اسے اپنایا اور یہاں کی کچی آبادیوں میں اسی کے مطابق کام کیا۔

فضل نور: شکریہ سمیر اگل، حافظ راشد۔ پروین رحمان اکثر مجھ سے کہتی تھیں کہ فضل تم بہت بڑے ڈکٹیٹر ہو کبھی کسی کو اپنی بات مکمل نہیں کہنے دیتے۔ آج بھی مجھے ایسا ہی لگ رہا ہے کہ وقت کی کمی کے پیش نظر ہم اپنے مہمانوں سے صرف دو سوال لیں گے۔

سوال: میں عارف صاحب سے پوچھنا چاہوں گا کہ یہ بات بہت واضح ہے کہ کراچی پر دباؤ ہے۔ کیونکہ ہم جو بات دیکھ رہے ہیں زمین ہتھیانے کی، اربنائزیشن کی اور گنجانیت کی۔ تو

How far do you think the breaking point of when it start self collapsing it becomes unliveable or are we already there or do you think that it will, theres enough resilience that it will continue to funtion someway on the other and function is of course a very broad word there because people are discussing this, talking about this that are we on the verge self collapse. Your thoughts that will be really appreciated.

عارف حسن: میرا خیال ہے کہ ہم collapse کر چکے ہیں۔ بس تھوڑی سی کسر رہ گئی ہے۔

There are huge areas in the city which have no water at all and if you look at them on a map. I would say there are more than 40% to the city. Secondly their is no social hosuing or support to housing. Our densities have increased so much through out 20 persons per toilet & 12 persons per room.

آپ کے شہر کی گنجانیت اتنی بڑھ گئی ہے جو کسی بھی طرح برداشت نہیں۔ 10 سے 12 آدمی ایک کمرہ میں رہتے ہیں۔ یہ حالات مزید بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس میں کوئی بہتری نہیں ہے۔ ٹرانسپورٹ ہمارے یہاں بالکل ہی نہیں ہے۔ آپ قرضہ لیکر موٹر سائیکل خرید سکتے ہیں۔ اس کے

علاوہ کچھ بھی نہیں ہے ۔میرا نہیں خیال کہ اس کا کوئی جلد حل نکلے گا۔مسائل بہت ہیں جنہیں صرف تجزیہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے ۔قوانین بنائے جانے کی ضرورت ہے ۔ یہ سارے کام کون کرے گا۔ادارے تو آپ کے پاس رہے نہیں ۔کوئی آرگنائزیشن نہیں ہے ۔ماسٹر پلان موجود نہیں ہے ۔وہ یہ سارے کام کرتا تھا۔ اس کا نام ونشان نہیں ہے۔ یہاں پر عوام کی شمولیت کی ضرورت ہے ۔انہیں آرگنائز کیا جائے ۔انہیں سپورٹ کیا جائے ۔تنظیمیں ہیں لیکن لوگ کام نہیں کر رہے ۔پہلے آگے کا سوچتے تھے لیکن آج کل جگاڑ کرتے ہیں ۔امیدیں واپس لانا بہت ضروری ہے ۔سرمایہ کاری ان چیزوں پر کی جارہی ہے جن سے عوام کو فائدہ نہیں پہنچے گا۔ یہ جو سڑکیں بننے جارہی ہیں ۔جو ساری ٹوٹی ہوئی ہیں لیکن کچھ مخصوص علاقوں میں ان پر کام ہورہا ہے ۔ٹرانسپورٹ میں جو بی آرٹی لیکر آرہے ہیں اس میں کتنا فائدہ ہے اور کس قدر مہنگا پروجیکٹ ہے ۔اگر یہ مکمل ہوجاتا ہے تو صرف 7 سے 8 فیصد لوگ ہی فائدہ اٹھا سکیں گے ۔ یہ پانچ مختلف روٹس ہیں اگر بن جاتے ہیں تو کمیونٹی 7 تا 8 فیصد ہی سفر کرسکے گی ۔ہم نے تو ان سے کہا تھا کہ یہ سرمایہ کاری نہ کریں اس کے بجائے 25 ہزار بڑی بسیں خرید لیں ۔اسے آرگنائز کر لیجئے یہ بہتر حل ہے ۔مگر وہ یہی کرنا چاہتے تھے ۔حکومتیں دکھانا چاہتی ہیں کہ کوئی اعلیٰ درجہ کی چیز ہوئی ہے ۔

کلام صاحب جو اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے ہیں انہوں نے 2003 یا 2004 میں مجھے ٹھیک سے یاد نہیں انہوں نے کہا تھا کہ میں سرکلر ریلوے کے پروجیکٹ پر نظر ثانی کرسکتا ہوں ۔لوکل فنڈنگ کرواسکتا ہوں ۔میں اس کی ساری مشینری مغل پورہ ورکشاپ میں بنواسکتا ہوں ۔ اس کی قیمت انہوں نے بہت مناسب اور کم بتائی تھی جو مجھے یاد نہیں لیکن وہ بہت اچھا تھا۔اسے ایک ڈیڑھ سال میں چل جانا تھا۔ان کی باتیں سنی گئیں ۔ جب وہ چلے گئے تو ایک صاحب تھے جو اب بھی ہیں انہوں نے کہا یہ دقیانوسی سوچ ہے ۔کیا ہم دلی سے کم ہیں ۔اور یوں یہ بات ختم ہوگئی ۔اور یوں اس کہانی کا خاتمہ ہوا۔انہوں نے اپنی ہی سوچ کے مطابق اسے کیا کہ وہ دلی سے کم نہیں ۔

فرحت اللہ قریشی: میں آپ سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر اختر حمید خان کون تھے۔آپ نے بات کی۔تسنیم صدیقی نے بات کی۔میری بھی ان کے ساتھ کئی ملاقاتیں رہی ہیں۔انہوں نے ہر کام منصوبے اور سوچ

حاضرین محفل دلچسپی سے گفتگو سنتے ہوئے

کو مستر د ہی کیا ہے۔میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ کون تھے۔اور دوسری بات کہ جو انہوں نے او پی پی کا منصوبہ پیش کیا تھا کیا آپ اسے ہر بلڈنگ کے لیے تجویز کر سکتے ہیں۔ایک اور بات آغا حسن عابدی نے جب انہیں کہا کہ اسکول کالج کھولیں اسپتال کھولیں تو انہوں نے کہا کہ نہیں میں تو بہاریوں کے لیے ہی کام کروں گا جو 1971 میں مشرقی پاکستان سے آئے تھے۔ان بہاریوں کو باقاعدہ پیسے دیئے گئے۔مصطفیٰ کمال سے پوچھیں کہ انہیں ایک ایک کروڑ روپے دیئے گئے۔گجر نالہ میں جو لوگ رہتے ہیں ان کو چالیس پچاس ہزار روپے دیئے گئے ہیں۔آپ لوگ اس طرح کی باتیں نہ کیا کریں۔کراچی کا ماسٹر پلان ڈیپارٹمنٹ ابھی موجود ہے۔لوگ کہہ رہے ہیں کہ ماسٹر پلان ہی نہیں ہے۔تیسرے ماسٹر پلان میں تو میں نے خود کام کیا ہے۔ایسی باتیں اوپن فورم میں نہ کیا کریں۔

سوال: سوال نہیں صرف تاثرات ہیں۔میری ملاقات دو تین بار ہوئی جب کراچی میں بڑی

مار دھاڑ ہو رہی ے تھی ۔ ایم کیو ایم کے خلاف نصر اللہ بابر آپریشن کر رہے تھے ۔اس وقت ہم لوگوں نے سٹیزن الائنس فار پیس بنایا تھا۔مختلف پارٹی اور مختلف بیک گراؤنڈ کے لوگ تھے ۔ہم ڈاکٹر اختر حمید خان کو بلالیا کرتے تھے اور وہ کہتے تھے کہ میں دیکھوں گا۔وہ آتے تھے اور ساتھ یہ بھی کہتے تھے کہ میں کہیں جاتا نہیں ہوں لیکن وہ آتے ضرور تھے ۔اس سے ہمیں بڑی تقویت ملتی تھی ۔وہ ایک اچھا تجربہ تھا۔ہم نے تو اپنی ساری زندگی سیاست میں گزاری ۔معراج محمد خان کا ساتھ ہوتا تھا ۔یہ تجربہ بہت قیمتی تھا۔آج وہ وقت پھر آگیا ہے ۔جیسے ایک بھائی نے سوال کیا۔میں سمجھتا ہوں کہ بہت کچھ ہوسکتا ہے بس ہمیں اس شہر کی ملکیت کو قبول کرنا ہے ۔ادھر اتنی تنظیمیں ہیں جو شہر سے متعلق کام کر رہی ہیں یا سوچتی ہیں لیکن ہم میں کوئی کوآرڈینیشن نہیں ہے ۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک امبریلا آرگنائزیشن ہو۔ ہر تنظیم آزادانہ طور پر کام کرے ۔لیکن ہم مل کر ذمہ داری لیں ۔ادھر تمام آبادیاں ،تمام قومیں بستی ہیں۔ یہاں vertical & horizontal understanding بن سکتی ہے ۔عارف حسن صاحب سے بھی اسی پر بات ہوئی تھی اس گفتگو کو ہم آگے لیکر جائیں گے ۔ یہ تجویز میں عارف صاحب پر چھوڑتا ہوں کہ اسے کیسے برقرار رکھا جائے ۔

Tariq: I would like to say first of all on a positive note that all what we've learn today and from Dr Sahib is always somthing that can be applied at any scale and my question is that can a lot of these policies to all of you be actually applied in to a master plannings stage earlier on in the development of cities where some of these policies can be in built into a master plan. Some of the things that Dr Sahib has proposed things about

how people could actually come together, their whole system of Muhallas, how in a master plan can you actually implement, certain thing that would make the price of the land and infrastructure lower, than in formalized master plan.

FazalNoor: Arif Sahib is sitting here just looking at his comment on the 1985 2000 master plan if you have read that and if you look at the overall discussion that has taken place today. We learn from the Orangi Pilot Project model that the standards on which design, engineering design, planning all these are based upon is not affordable for the people that mainly that the way master plan itself is made is one of the main reason is to get international finances. It is not made to solves the problem itself. So the process of master planning itself is not really geared towards an affordable and, what Arif sahib called, a populist bias master plan. So these things can never be any master plan process because the master planning is not done for that purpose. I would like just ask to Arif Sahb point to the

Strategic Development Plan 2020 and when it was made there was a lot of debate on this issue and he pointed to something because of which the term itself, "the master plan", was changed to strategic development at that time Arif Sahb whould you like to comment?

عارف حسن: پلان جو مرضی بنالیں پلان بنانے کا کیا ہے۔ پلان تو کوئی چیز ہوتی نہیں۔اصل چیز اس کا نفاذ ہے جس کی ذمہ داری اداروں کی ہوتی ہے۔ پلان تو بہت اچھے بنتے ہیں 1952 سے بنتے آرہے ہیں۔ان سب کی تفصیلات موجود ہیں۔اس منصوبے کی بھی موجود ہیں اور صرف ہماری تنقید نہیں ہے۔international academic نے بھی اس پر تنقید کی ہے۔ So you can plan for whatever you like there's nothing stopping you for doing it. اب دوسرا مسئلہ ہی ہے کہ آپ حقیقت کو سمجھتے ہیں یا نہیں سمجھتے اگر سارے جو پلان بنے تھے اگر وہ implement ہوتے بھی ہم پوچھتے ہیں کیوں نہیں ہوئے implement کیا مسئلہ تھا کیونکہ وہ پلان تھے ہی نہیں وہ خواب تھے اور اب بھی خواب ہیں۔ اسی وجہ سے پانی نہیں ہے اسی وجہ سے ٹرانسپورٹ نہیں ہے، اسی لئے کھانے کو نہیں ہے، اسی وجہ سے ملازمتیں نہیں ہیں کیونکہ وہ خواب تھے اور اچھے خواب تھے۔

فضل نور: ملیر کا جو واقعہ تھا جس کا انہوں نے کہا تھا شہری جب اکٹھے ہوتے ہیں تو کیا ہوتا ہے۔

So there are a both positive sides of people getting together and there is also a point that what can be done. So Inshallah we will keep trying and how to

manage the c h a l l e n g e of the nexus that Mustafa Sahab told us about and how to take Dr Akhter Hameed Khan's hopes and whole approach towards urban project forward and so with this i thank you all for being here and participating in this.

اب ہم آج کی اس یادگار نشست کا باقاعدہ اختتام کرتے ہیں ۔میں اپنے تمام سینیئر پینلسٹ کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے بہت خوبصورت یادیں پیش کیں ۔ڈاکٹر صاحب اور کمیونٹی کے حوالے سے اپنے مشاہدات بیان کئے ۔آج کی میزبان انعم مفتی کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو بہت خوبصورتی سے اس پروگرام کو لیکر چلیں ۔آج کے تمام والینٹیئر ز کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے اس پروگرام کو ترتیب دینے میں ہماری مدد کی ۔آپ تمام مہمانانِ گرامی نے اپنے قیمتی وقت میں ہمارے ساتھ شرکت کی ۔ہمارے نوجوان طلباء ہمارے ساتھ شامل رہے ۔ ہم ان سب کے ممنون ہیں اس دعا کے ساتھ کہ آئندہ بھی اس طرح کی نشستیں ہوتی رہیں گی ۔

اب کھانے کا وقفہ ہے جس کے بعد ہم اپنے طلباء کے ساتھ ایک ورک شاپ کریں گے جسے ہمارے محترم ساتھی ڈاکٹر نعمان احمد نے ترتیب دیا ہے ۔

بہت شکریہ.

☆------------- ☆------------- ☆

پروگرام کے آخری اور تیسرے حصے میں طلباء کی ورک شاپ

Rethinking Development in Pakistan

کے موضوع پر منعقد کی گئی جس میں مختلف یونیورسٹیز کے طلباء نے حصہ لیا

طلباء ورک شاپ میں مصروف ہیں

طلباء اپنے اسائمنٹ کی تیاری کرتے ہوئے

ورک شاپ کے اختتام پر طلباء اپنے اساتذہ کے ساتھ

ڈاکٹر اختر حمید خان کانفرنس برائے سماجی ترقی

یہ کانفرنس مئورخہ 20 نومبر 2021 شعبہ مطالعہء ترقیات این ای ڈی یونیورسٹی (سٹی کیمپس) میں منعقد ہوئی۔

جس میں درج ذیل اداروں نے تعاون کیا۔

OPRCT

ڈاکٹر اختر حمید خاں (1914—1999)

یہ کانفرنس مئورخہ 20 نومبر 2021 شعبہ مطالعہء ترقیات (این ای ڈی یونیورسٹی ۔سٹی کیمپس) میں منعقد کی گئی ۔اس کانفرنس کا مقصد ڈاکٹر اختر حمید خان کے متعلقہ کام اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ہے تا کہ بالخصوص ہماری نوجوان نسل ڈاکٹر صاحب کے افکار کو جان سکیں۔

اختر حمید خاں 1914ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ 1934ء میں میرٹھ کالج سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ 1936ء میں آئی سی ایس کے مقابلے میں منتخب ہوکر دو سال کے لئے کیمبرج چلے گئے ۔واپسی پر صوبہ بنگال میں تعیناتی ہوئی۔ 1944ء میں سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے کر سادہ اور آزاد زندگی اپنائی ۔ 1947ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) میں بحیثیت استاد تدریسی ذمہ داریاں ادا کیں۔ 1950ء میں کومیلا اکیڈمی میں کام کرتے رہے ۔ 1971ء میں کومیلا کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور پاکستان آکر انہوں نے فیصل آباد، کراچی یونیورسٹی اور پشاور اکیڈمی میں کام کیا۔ 1975ء سے 1979ء تک مشی گن اسٹیٹ یونیورسٹی میں پروفیسر رہے۔

1980 میں اپنی دوراندیشی کی بناء پر اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کی بنیاد رکھی جو کمیونٹی آرگنائزیشن کے لیے ایک سنگِ میل ثابت ہوا۔ڈاکٹر صاحب کے سوچ اور فلسفہ سے متاثر ہوکر کئی دیگر ادارے وجود میں آئے ۔اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے پیچھے کئی ایسے شاگرد چھوڑے ہیں جو خود اپنی ذات میں ایک ادارہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن میں عارف حسن ،انور راشد، تسنیم صدیقی اور پروین رحمان شامل ہیں۔

اختر حمید خاں مطالعہ کا ذوق رکھتے تھے ۔انہوں نے اردو، انگریزی ،عربی ، فارسی ،ہندی اور بنگالی ادب کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔کومیلا کے اقتصادی اور انتظامی تجربات کی بنا پر ان کو " ستارہ پاکستان " اور جمہوریہ فلپین کا مگسائی سائی ایوارڈ ملا۔ مشی گن اسٹیٹ یونیورسٹی نے انہیں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا اہم پہلو ان کا شاعری سے لگاؤ تھا ۔ان کا کلام ”چراغ اور کنول“ کے نام سے شائع ہوا۔اس مجموعہ کا نام ڈاکٹر صاحب کی سوچ کی علامت ہے۔

شعبہ مطالعہء ترقیات
این ای ڈی یونیورسٹی

اربن ریسورس سینٹر
یو آر سی، کراچی

قیمت 200 روپے